MUD-008

کلاسیکی اردو شاعری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

6

6 اُردو کے نمائندہ مرثیہ نگار اور متن کی تدریس و تفہیم

بلاک 6 کا تعارف

اکائی 23
میر انیس، حیات، مرثیہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے) (منتخب بند) 61

اکائی 24
مرزا دبیر: حیات، مرثیہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے)(ابتدائی پچاس بند) 77

اکائی 25
میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ 109

بلاک 6 تعارف

بلاک 6

اکائی 23 - میر انیس حیات، مرثیہ نگاری اور متن کی تدریس

ساخت

23.1 اغراض ومقاصد

23.2 تمہید

23.3 میر انیس: حیات اور شاعری

23.4 میر انیس کی مرثیہ نگاری

23.5 متن کی تدریس

(i) جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

(ii) یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام

23.6 آپ نے کیا سیکھا

23.7 اپنا امتحان خود لیجئے

23.8 فرہنگ

23.9 کتب برائے مطالعہ

23.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- میر انیس کی حیات اور ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے۔
- میر انیس کے فکر وفن کو سمجھ سکیں گے۔
- میر انیس کی شعری انفرادیت اور مرثیہ نگاری سے شناسائی حاصل کریں گے۔
- میر انیس کی مرثیہ نگاری کی فنی خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔
- میر انیس کے مرثیوں کی تشریح سمجھ سکیں گے۔

23.2 تمہید

میر انیس کا شمار اردو کے نمائندہ مرثیہ گو شعرا میں ہوتا ہے ان کے اجداد ہرات سے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ میر انیس کے پردادا میر ضاحک شاعر تھے ان کے دادا میر حسن جنہوں نے مثنوی سحر البیان لکھی تھی۔ میر انیس کے والد میر خلیق نے مرثیہ اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ میر انیس نے غزلیں بھی کہیں لیکن فنِ مرثیہ گوئی میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ میر انیس کا تعلق لکھنؤ اور فیض آباد دونوں ہی شہروں سے یکساں رہا۔ ضمیر اور خلیق کے بعد انیس و دبیر کے نام سامنے آتے ہیں۔ میر انیس مرثیہ خوانی میں بھی بہت مشہور تھے۔ وہ کم گو واقع ہوئے تھے۔ مزاج میں شائستگی اور لہجہ میں متانت اور شگفتگی تھی۔ اپنی تعریف و توصیف پسند نہیں کرتے تھے انہوں نے کم عمر ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ انیس مستقل طور پر لکھنؤ ہی میں سکونت پزیر رہے۔ انہیں آتش، ناسخ، ضمیر، خلیق اور دیگر اہم استاد شعرا کی صحبتیں میسر آئیں۔

میر انیس بڑے وضعدار انسان واقع ہوئے تھے۔ لکھنؤ کی ادبی محفلوں اور شائستہ علمی ماحول نے ان کے ذوق شعری کو اور بھی جلا بخشی۔ گرمی اور جاڑے کے موسم کے لباس مختلف تھے، گھٹنوں سے اونچا کرتا پہنتے تھے، گرمی کے موسم میں سفید پاجامی اور سردی میں سبز یا کالے رنگ کا پائجامہ پہننا پسند کرتے تھے، گرمیوں میں سفید اور سردیوں میں رنگین ٹوپی ہوتی تھی، منکسر المزاج اور کم سخن واقع ہوئے تھے، بلند آواز اور خوش الحان تھے، مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے۔

فصاحت میر انیس کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ انیس کی فصاحت اور بلاغت کا ذکر علامہ شبلی نے بھی اپنی تصنیف موازنہ انیس و دبیر، میں کیا ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں واقعات کی تصویر کشی اور جذبات نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ میر انیس نے ابتدا میں غزلیں کہیں لیکن انہیں سلام کہنے میں زیادہ دلچسپی تھی خاصی تعداد میں ان کے سلام ملتے ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے درمیان ادبی معرکے بھی رہے، اس اکائی میں میر انیس کی حیات، مرثیہ نگاری اور اجزائے ترکیبی کی روشنی میں دو بند کا انتخاب (جب قطع کی ساخت شب آفتاب نے، یہ صبح ہے وصبح مبارک ہے جس کی شام) کی تشریح کی گئی ہے۔

یونٹ کے آخر میں فرہنگ کے طور پر مشکل الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں۔ مطالعہ کے لئے اہم کتب کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

.....

23.3 میر انیس: حیات اور شاعری

میر انیس کا تعارف

میر ببر علی نام انیس تخلص تھا۔ پیدائش ۱۸۰۳ کو محلّہ گلد باڑی فیض آباد کے علمی گھرانے میں ہوئی ابتداء ہی سے ان کے گھر میں شعر وسخن کا ماحول تھا۔ میر انیس کے زمانے میں اردو کی تعلیم وتدریس نصاب کا حصہ نہیں تھی۔ اساتذہ خاندانی روایت کے مطابق ذاتی شوق کی بنیاد پر درس دیا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم، اپنے والد میر خلیق سے گھر پر حاصل کی۔ انیس کو فارسی زبان وادب پر دسترس حاصل تھی۔ پانچ برس کی عمر ہی سے ان کی طبیعت موزوں ہونے لگی تھی۔ فن سپہ گری، شہ سواری اور تلوار زنی اس دور کی روایات اور تربیت میں شامل تھی میر انیس بھی اس فن سے واقف تھے۔ ابتدا میں ان کا تخلص حزیں تھا لیکن ناسخ نے انیس تخلص کرا دیا تھا۔ انہوں نے پہلا مرثیہ چودہ برس کی عمر میں زنانی مجلس کے لئے کہا تھا۔ ابتدا میں غزل گوئی کی طرف مائل تھے لیکن ان کے والد نے غزل کہنے پر پابندی لگا دی بعد ازاں وہ مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ میر انیس ایک اعلیٰ پائے کے مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ایک کامیاب مرثیہ خواں بھی ثابت ہوئے ان کے والد میر خلیق مرثیہ گوئی کے علاوہ مرثیہ خوانی میں بھی انہیں استاد تسلیم کرتے تھے۔ انیس نے مرثیہ خوانی کو تحت اللفظ کا فن عطا کیا اور اس کے اصول وآداب بھی مقرر کئے۔ ان کے اساتذہ میں میر نجف علی اور مولوی حیدر علی کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ انیس کی شادی انیس ۱۹ برس کی عمر میں ۱۸۲۲ کے قریب لکھنؤ میں فاطمہ بیگم سے ہوئی۔ لکھنؤ میں انیس کے فن کی خوب پذیرائی ہوئی۔ شعری ورثہ جو میر ضاحک سے شروع ہوا تھا میر حسن سے ہوتا ہوا میر خلیق تک پہنچا اور میر انیس کو میسر آیا۔ یہ فنی امتیاز میر انیس کے علاوہ اس دور کے کسی اور شاعر کو حاصل نہیں تھا۔ مرثیہ خوانی ان کا ذریعہ معاش بھی تھا۔ انیس کم گفتار لیکن خوش آواز تھے، تخلیق کا سیل رواں ان کا فنی وصف تھا، انہیں اردو اور فارسی کے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے، المیہ نگاری اور رثائی کلام کے ساتھ انیس کے یہاں حسِ مزاح کا عنصر سامنے آتا ہے۔ ان کے تینوں سوانح نگار اشہری، احسن اور شاد نے اپنی تحریروں میں ان کے اس فنی وصف کا ذکر کیا ہے۔ انیس عموماً دیر سے سو کر اٹھتے تھے۔ چند گھنٹوں کے بعد کھانا کھاتے تھے۔ انہیں آم بہت پسند تھے۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا مختصر لائبریری تھی تقریباً دو ہزار کتابیں صندوق میں جمع تھیں۔ ورزش اور سپہ گری کے علاوہ پتنگ بازی کبوتر اڑانا اور جانوروں میں بلی پالنے کا بہت شوق تھا۔ موسیقی اور سوز خوانی کے شائق تھے۔ اس دور کے رواج کے مطابق انیس حقہ بھی پیتے تھے نفیس لباس اور اعلیٰ قسم کی غذا پسند کرتے تھے۔ ملازموں کے ساتھ اچھا برتاؤ تھا۔ دوستوں سے حسنِ سلوک اور اساتذہ کا احترام کرتے تھے۔

اگر چہ میر انیس کا آبائی مذہب شیعہ تھا لیکن ان کے کلام میں تصوف کا عنصر موجود ہے۔ انیس کے ذمہ اہل خانہ اور ملازمین کی کفالت کی ذمہ داری تھی۔ معاصرین کے علاوہ تلامذہ کا بھی بڑا حلقہ ان سے وابستہ تھا۔ میر انیس نے صنف مرثیہ کو نئے معنی ومفاہیم اور ایک مستقل فن کے طور پر روشناس کرایا۔ غزلیں بھی کہیں لیکن غزل سے انہیں خاص دلچسپی نہیں رہی۔

۱۵ر دسمبر ۱۸۷۴ کو ۷۵ برس کی عمر میں میر انیس کا انتقال ہوا اور آخری رسومات لکھنؤ میں ادا کی گئیں۔

23.4 میر انیس کی مرثیہ نگاری

مرثیہ کو اردو شاعری میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عالمی سطح پر بھی یہ صنف اردو شاعری میں نقش اول ثابت ہوئی۔ اس صنف کی کوئی مخصوص ہیت بھی نہیں ہے۔ غزل اور مثنوی کی فارم میں بھی مرثیے تخلیق کئے گئے لیکن بیشتر مرثیے مسدس کی شکل میں ملتے ہیں۔ مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے اور 'رثا' سے نکلا ہے۔ اس کے فنی لوازمات میں جذبات نگاری' واقعات کی تصویر کشی' اور رزم آرائی کو بہت اہمیت حاصل ہے اجزائے مرثیہ کے ذیل میں اس کی ابتدا مختلف پہلوؤں سے ملتی ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی مرثیہ کا رواج رہا۔ مرثیہ کے فن میں تراکیب بند کے علاوہ نعت و منقبت مناجات یا پھر کسی فطری منظر کا بیان بھی اس میں شامل ہے۔ قطعہ، رباعی اور مخمس کی شکل میں بھی مرثیہ لکھا گیا۔

اردو شاعری میں مرثیہ مقبول صنف تسلیم کی گئی۔ مرثیہ ہندوستانی صنف ہے۔ دکن میں اس صنف کی ابتدا ہوئی اور بہمنی سلطنت میں اس صنف کو با قاعدہ برتا گیا۔ دکنی شعرا نے غزل کی ہیت میں مرثیہ کہے محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواص، اور شاہی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں شمالی ہند میں جن شعرا نے مرثیہ کہے ان میں سکندر، جرات، مصحفی، میر حسن، اور قایم چاند پوری کا ذکر ملتا ہے۔ پہلا مرثیہ مسدس کی شکل میں سودا نے کہا آہستہ آہستہ مرثیہ کے فن اور محاسن کلام اور زبان و بیان میں تبدیلی پیدا ہونے لگی اور موضوعات میں وسعت بھی پیدا ہوگئی۔

انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں مرثیہ کو عروج حاصل ہوا اور اردو کے اہم مرثیہ گو استاد شعرا دلگیر، فصیح، میر ضمیر اور میر خلیق نے اس کی آبیاری کی اور نئے مفہوم و معانی سے اس فن کو آراستہ کیا۔ لکھنؤ میں مرثیہ کہنے والوں کی بڑی تعداد تھی لیکن جو مقام و مرتبہ انیس و دبیر مرزا آتش اور مونس کو حاصل تھا وہ کسی اور کو نہیں ملا تھا۔ دبیر اس فن پر اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے۔ بعد ازاں انیس نے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ اور مرثیہ کو اہل لکھنؤ کے سامنے نئے رنگ و آہنگ اور نئی طرز کے ساتھ پیش کیا یہ دور اردو مرثیہ کا عہد زریں قرار دیا گیا۔ ابتدا میں انیس نے اپنے کلام کے ذریعہ اس طرح متوجہ کیا۔

گلدستۂ معنی کے نئے ڈھنگ کو دیکھیں
بندش کو نزاکت کو نئے رنگ کو دیکھیں

.....

میر انیس کا فن:

انیس کی مرثیہ نگاری کی مقبولیت اور شہرت دہلی اور عظیم آباد کی ادبی محفلوں تک پہنچ گئی۔ اہل لکھنؤ انیس کے فن اور مرثیہ نگاری

کوتسلیم کر چکے تھے۔اگر چہ دبیر کی مرثیہ نگاری کی اہمیت اور قدر و قیمت میں کمی واقع نہیں ہوئی لیکن انیس کے کلام کی سادگی تضع اور مرصع سازی انیس کے فن کوتسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

لہجہ سنو زبان فصاحت نواز کا
تار نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا

مولانا حالی میر انیس کی تعریف ان اشعار میں کرتے ہیں۔

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیس
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کو یہ دعوٰی ہے ہمارا تھا انیس

.....

انیس کے مرثیوں میں فصاحت، روانی، جذبات نگاری تصویر کشی، مکالمہ نگاری، واقعات نگاری، سیرت نگاری، کردار نگاری الفاظ کی دروبست، شعری بیانیہ کا سیلِ روان، امتیازی وصف تصور کئے جاتے ہیں۔

میر انیس کا مخصوص شعری اسلوب بیان ان کے بعد کے شعرا کے لیے تقلید کا باعث بنا۔انیس نے واقعات کربلا کو نہایت ہی فن کارانہ انداز میں جذبات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہر واقعہ اور کردار کو مخصوص شعری انداز اور نئے پیکر میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔انیس نے مرثیہ کو لسانی پیکر سے مزین کیا۔اور زبان کی نئی لسانی طرز کو قلم اور فن کے ذریعہ پیش کیا۔

''انیس نے بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیئے۔ ایک ایک موقع کو سو سو طرح بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا۔آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں اگر ہم اس کو معیار کمال قرار دیں تو بھی میر انیس کو اردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔''

(مقدمہ شعر و شاعری)

شعر الہند کے مصنف نے لکھا ہے کہ اردو میں واقعہ نگاری کی بنیاد مرثیہ گو شعرا نے ڈالی اور میر انیس کو اس فن میں امتیاز حاصل ہے۔

میر انیس کو مرثیہ گوئی کا فن ورثہ میں میسر آیا جنگ کے واقعات کا نقشہ کھینچنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھی۔مرثیہ میں آٹھ اجزائے ترکیبی کو خوب برتا۔مرثیہ گوئی کے فن میں میر انیس کو کمال حاصل ہے۔فصاحت اور بلاغت کے ذیل میں چند اشعار پیش ہیں۔

طاقت دکھاؤں میں جو رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

.....

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

.....

یوں تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

.....

انیس کے یہاں دہلی اور لکھنؤ اسکول کی لسانی اور تہذیبی وثقافتی خوبیوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔جس میں سادگی وسلاست کے ساتھ دہلی کی ٹکسالی اور لکھنؤ کی بیگمانی زبان کا حسن شامل ہے۔میر انیس کے مرثیون کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ انیس کا ہر مرثیہ نئے رنگ ومعنی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔۔

'دعا' کے ذیل میں منظر نگاری اور فطرت کی تصویر کشی کا ایک نمونہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں　　قطرے کو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کو چمک مہر منور سے ملا دوں　　خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملادوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہوتو سو رنگ سے باندھوں

.....

میدان کربلا میں نماز فجر کے وقت صبح کا بیان امام حسین اپنے اصحاب کی سیرت اور اوصاف کا بیان کررہے ہیں انیس اس واقعہ کو اپنے مخصوص انداز میں ان اشعار میں پیش کرتے ہیں۔پانی کی قلت اور وضو کی حاجت ہے تیمّم چہروں کو تابنا کی اور اور توانائی کس طرح عطا کرتی ہے۔

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب　　پر تھی رخوں پہ خاک تیمّم سے طرفہ آب
باریک ابر پر نظر آتے تھے آفتاب　　ہوتے ہیں خاکسار، غلام ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہوگئی
مٹی سے آئینوں میں جلا اور ہو گئی

.....

فطرت کی منظر نگاری کا ایک اور نمونہ دیکھئے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے قرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبز ے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب باد صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

.....

جوش اور اقبال سے قبل میر انیس کے یہاں اردو الفاظ کا سب سے زیادہ استعمال ملتا ہے۔ نئی تراکیب و اصطلاحات ثقافتی، تہذیبی اور رزمیہ لفظیات میر انیس کی لسانی اور قاموسی مہارت میں شامل ہیں۔ لیکن عربی کے الفاظ اور محاورے انیس نے اپنے مرثیوں میں استعمال نہیں کئے۔ البتہ عربی فقرے یا آیات قلم بند کر دی ہیں۔

بے جا نہیں مدح شہ میں غرا میرا
بھرتی سے کلام ہے معرّا میرا

میر انیس کی رزمیہ شاعری:

میر انیس کو رزم نگاری میں فنکارانہ مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے سبھی اجزائے ترکیبی کو بڑی کامیابی کے ساتھ جگہ دی ہے پرانے رزمیہ انداز کو نئی طرز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرثیہ میں چہرے کا ایک مصرعہ ہے۔

'جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا'

انیس میدان کربلا میں صبح صادق کا منظر ان اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

.....

تلوار کے بیان میں ان اشعار میں شعر کہتے ہیں۔

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی ادھر اک خوں کی ابلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی

.....

ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سانحہ کربلا کے اہم کرداروں میں امام حسین، حضرت عباس، زینب اور سکینہ کے علاوہ عون و محمد، علی اکبر، حضرت قاسم اور فضہ بھی شامل ہیں ان کا ذکر اور شخص و انفرادی طور پر اوصاف حمیدہ حفظِ مراتب حامل ہے۔ اور واقعات بھی ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں۔

بولے فرس کو روک کے شاہ فلک وقار — منزل پہ ہم پہنچ گئے احسان کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار — یہ وہ زمیں ہے جس کو لئے دل تھا بیقرار
قربان اس مکان سعادت نشان کے
پایا درمراد بڑی خاک چھان کے

.....

ساتھیوں حضرت حسین نے میدان کربلا پہنچ کر دریافت کیا یہی سرزمین کربلا ہے اور اپنے مقتل کا یقین دلایا۔

قربان اس مکان سعادت نشان کے
مقتل یہی زمیں ہے، یہی مشہدِ امام

.....

انیس کے کلام میں فصاحت اور بلاغت کے فن کارانہ نمونے بہترین تشبیہات و استعارات کا استعمال کلام میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔

بستر لگاؤ شوق سے اس ارض پاک پر — چھڑکا ہوا ہے آب بقا یاں کی خاک پر
اس کے مکیں نہ ہوں گے پراگندہ نشر میں — بے سر اسی زمین سے اٹھیں گے حشر میں
جائے گا ہاتھوں ہاتھ یہ طبقہ بہشت میں

روز عاشورہ نہر پر پہنچتے ہیں تو میر انیس اس واقعہ کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

نعرہ کیا ترائی تو شیروں کا ہے مقام　　وہ زور شور کیا ہوا اسے ساکنانِ شام
تم سب کی کیا بساط ہے دامن کی گرد ہو　　ہاں اب ہمیں ہٹاؤ تو جانیں کہ مرد ہو

.....

نئے الفاظ وتراکیب قاری کے ذہن کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ ذہنی آسودگی اور جزوی طور سے آسانی سے ذہن نشین بھی ہوجاتے ہیں۔

میر انیس کے یہاں رزمیہ شاعری کے بیان میں منظر نگاری کے بڑے جاذب نظر نمونے ملتے ہیں۔ گرمی کی شدت سفر کی دشواریاں شجر اور برگ وثمر کا گرمی سے جھلسنا مندرجہ ذیل بندوں میں پیش کیا ہے۔

وہ کوس کڑے اور پہاڑوں کی وہ راہیں　　یہ دھوپ میں شدت تھی کہ جلتی تھیں نگاہیں
دشوار تھا پانی کسی چشمے میں سے جو چاہیں　　اٹھتا تھا دھواں ان سے نکل جاتی تھیں آہیں
سونلد گئے تھے چاند سے منھ سیم بروں کے
ثابت تھا کہ خورشید برابر ہے سروں کے

.....

رزم گاہ کا ایک دل سوز منظر ان اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

نرغہ میں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال　　امال کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے میرے بال　　میں لٹ رہی ہوں اور تمہیں منصب کا ہے خیال
غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
معلوم ہو گیا تجھے طالب ہو نام کے

مذکورہ اشعار میں میر انیس کی شعری فصاحت الفاظ کی دروبست جذبات کی تصویر کشی کی بہترین مثال پیش کی گئی ہے۔ روزِ عاشورہ میں گرمی کی شدت کا بیان بڑے موثر انداز میں اس طرح کیا ہے۔

گرمی کا روز جنگ کی کیا کیجئے بیاں　　ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں　　دن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آب خنک کو خلق تڑپتی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

.....

پانی تھا آگ گرمیِ روز حباب تھی
ماہی جو شیخ موج تک آئی کباب تھی

اس شعر میں انیس نے بلاغت کا نمونہ دکھایا ہے۔

انیس کی قادرالکلامی اور معلومات علمی کی اشعار میں یہ کیفیت فصاحت اور بلاغت کا نادر نمونہ پیش کرتی ہے۔ ذیل کا یہ بند الفاظ کے ذریعہ تنفسِ مضموں کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہ امم نہ دامن رسول تھا نہ سایۂ علم
اودے تھے لب زباں پہ کانٹے کمر میں خم شعلے جگر سے آہ کے اٹھتے تھے دم بدم

بے آب تیرا تھا جو دن مہیمان کو
ہوتی تھی بات بات پہ لکنت زبان کو

.....

تلوار کی تیز رفتاری اور قوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آپہنچا اس کی گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہ گیا

''سراپا کے ذیل میں فن کاری کا ایک بہترین نمونہ پیش ہے۔

حلقے نہیں یہ گیسوئے عنبر سرشت کے
دیکھو کھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

.....

فاقے میں دیر تک جو لڑے شاہِ تشنہ کام
آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپِ تیز گام
غش میں سوار دوش نبی کا یہ حال تھا
بے تھامے خود فرس سے اترنا محال تھا

.....

مظلوم ہوں مجبور ہوں مجروح جگر ہوں
تو صبر عطا کر مجھے یا رب کہ بشر ہوں

میر انیس ایک باکمال مرثیہ گو بھی تھے اور مرثیہ خواں بھی واقعہ کی جزئیات اور تفصیلات پر انہیں گرفت تھی واقعات کے شعری

بیانیہ پر انیس کو مہارت حاصل تھی۔

منظر نگاری اور پیکر تراشی سے کسی تاریخی اور سچے واقعہ میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعہ کربلا کی مختلف جزئیات کو انیس مختلف موثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

میر انیس جذبات نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں جذبات کی مختلف کیفیات اور مدارج ہوتے ہیں اور متضاد صورت حال بھی مثلاً خوشی، غم، غصہ، جرت، طاقت و توانائی اور شجاعت کا اظہار، حرکات و سکنات کے ذریعہ جذبات کا تاثر مرثیہ میں حقیقی کرداروں کی سچی اور صالح جذبات کی عکاسی انیس کا فن کمال ہے۔

ہر مرتبہ لڑے ہیں لہو میں نہائے ہیں
پیری میں نو جوانوں کے لاشے اٹھائے ہیں

.....

کربلا کے کرداروں میں اور خصوصاً اہل بیت کی اہم شخصیات کی سیرت نگاری کے شعری بیانیہ میں انہیں کمالِ فن حاصل ہے۔ سیرت نگاری کے اتنے اعلیٰ نمونے انیس سے قبل نہیں ملتے۔ یہ نمونے انڈو عربک تہذیب کا بہترین امتزاج ہے۔ مرثیہ کا ایک بند ذیل میں نقل ہے۔

ڈوبے ہوئے تھے خون میں گیسو حسین کے آنکھوں پہ کٹ کے آپڑے ابرو حسین کے
زخمی ہیں دونوں ساعدو بازو حسین کے تیروں نے چھان ڈالے تھے بازو حسین ک
تیغیں اپی ہوئی جو برابر سے چل گئیں
غش آگیا قدم سے رکابیں نکل گئیں

.....

سلاست و روانی، حسن بیان، فصاحت و بلاغت کا امتزاج، ایک مصرعہ میں کئی صنعتوں کا برجستہ استعمال، رعایت لفظی، محاورے اور مکالمے جو شعری اسلوب کے ساتھ نثر کا لطف دیتے ہیں سیرت نگاری میں رشتہ اور حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں۔ اہل بیت کے درمیان اور ان کے اقربا سے گفتگو میں فصاحت اور تہذیبی اقدار اور متین لہجہ کو برقرار رکھتے ہیں۔

شعری بیانیہ کا حسن، خیالات کا سیلِ رواں کلام میں ترتیب و تسلسل، مصرعوں اور اشعار میں باہمی ربط اور لفظ و معنی کی مناسبت سے ایک مخصوص قسم کا وصف و اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریف اس دور میں مرثیہ نگاری کا اہم جز تھا۔ گھوڑے کے اوصاف، تیز گامی کا بیان قابل ذکر ہے، وہ شمیر زنی کے فن سے بھی واقف تھے شہ سواری کی اصطلاحوں پر انہیں عبور تھا۔ منظر نگاری اور رزمیہ شاعری پر انہیں مہارت حاصل تھی۔ ردیف و قافیہ کے برتنے میں بھی انہیں دسترس ہے۔ مشکل قافیے آسانی سے نظم کر دیتے ہیں۔ لیکن کہیں پر مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا ہے۔

میر انیس نے مرثیہ کے آٹھوں اجزائے ترکیبی کو فنی اعتبار سے خوب برتا ہے لیکن سراپا، رجز رخصت اور بین کے ذیل میں

انہوں نے اپنے فن کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔

دبیر اور انیس کے یہاں دہلوی اور لکھنوی رنگ سخن کا واضح فرق نظر آتا ہے۔ میر انیس کے کلام میں مضمون آفرینی سے زیادہ اثر آفرینی کا عنصر ملتا ہے۔ لیکن دونوں ہی اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے لیکن انیس کی فصاحت اور رنگ سخن کو زیادہ پذیرائی ملی۔

اردو مرثیہ نگاری کے فن کو میر انیس نے نئی شعری روایات اور اسالیب فکر سے روشناس کرایا اور اپنے فن کے ذریعہ مرثیہ کے ذہنی افق کو بلندی عطا کی اور موضوعات و جہات میں ندرت پیدا کی۔

23.5 متن کی تدریس

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے　　جلوہ کیا سحر کا رک بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے　　مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

.....

تشریح:

میر انیس کے مرثیہ کا یہ بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ جو انیس کے مرثیوں میں شاہکار تخلیق کا حامل ہے۔ یہ بند اجزائے مرثیہ کو ذہن میں رکھ لکھا گیا ہے۔ حضرت امام حسین میدان کربلا میں اپنے ساتھیوں اور اہل خانہ کے ساتھ خیمہ زن ہیں اس بند میں صبح کے منظر کا بیان نہایت ہی فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے ایک مخصوص روحانی فضا کا احساس ہوتا ہے۔

حضرت امام حسین نے روحانیت سے پر مدبرانہ انداز میں آسمان کی جانب نظر ڈالی۔ اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا جو خیموں میں آرام فرما رہے تھے انہیں یہ خبر دی کہ رات کی تاریکی ختم ہو چکی ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ خدا کی حمد و ثنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اٹھو اور فریضہ سحر یعنی سب مل کر فریضہ نماز ادا کرو۔ خدا کے سامنے سر بہ سجود ہو کر دعا کرو اور اس کا حکم بجالاؤ۔ اس بند میں صبح کے وقت کی بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام　　یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام　　لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
سب ہیں وحید عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سر خرو اٹھے

.....

تشریح:

میر انیس کو منظر کشی کی جزئیات نگاری پر یدِ طولیٰ حاصل ہے وہ ایک مضمون کو سو طرح سے پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ چھ مصرعوں پر مبنی اس بند کا پہلا مصرعہ واقعہ کربلا کی تاریخ اور مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے اس بند میں صبح اور شام کی متضاد کیفیت معنی خیز نتائج کی طرف نشاندہی کرتی ہیں۔یعنی حضرت امام حسین کہتے ہیں کہ اس دن کی صبح کا خاتمہ ایک ایسی مبارک شام پر ہوگا کہ یہاں سے کوچ کرنے کے بعد جنت الفردوس ہمارا مسکن و مقام ہوگا جنت اہل بیت کی مستقل قیام گاہ ہے، اور امام حسین دعا گو ہیں کہ خدا کے ہم امتحان میں کامیاب ہوں اور تشنہ کام عزت و آبرو کے ساتھ حوض کوثر تک پہنچ جائیں۔خدا ہم سے راضی ہو جائے اور نماز ادا کرنے والوں میں ہمارا نام ہمیشہ شامل رہے۔

دنیا میں یہ شور و غل بہت ہے کہ آل رسول اور محبّ اہل بیت یگانہ و یکتا ہیں، وحید عصر ہیں جن کا عمل اور اخلاق بلند ہے اور راہ خدا میں قربانی کے لئے مشہور ہیں۔ دیگر شہدا کی طرح ہم بھی خدا کے سامنے سرخ روح ہو کر جائیں اسی طرح جیسے خدا کی راہ میں قربانی دینے والا ہر شہید کامیاب و کامران ہو کر خدا کے حضور میں پیش ہوا اور دنیا سے سرخ رو ہو کر گیا۔

.....

آپ نے کیا سیکھا

- میر انیس کے سوانحی حالات اور تعلیمی زندگی کا علم ہوا
- میر انیس کی شعری خصوصیات سے واقفیت ہوئی
- میر انیس کی مرثیہ نگاری پر گرفت کا اندازہ ہوا
- میر انیس کے مرثیہ کے دو بندوں کی تشریح سمجھ میں آئی
- اردو مرثیہ نگاری میں میر انیس کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوا

.....

اپنا امتحان خود لیجئے

میر انیس کا پورا نام، پیدائش اور وفات بیان کیجئے۔

میر انیس کی شاعری کی فنی خصوصیات مختصراً بیان کیجئے۔

میر انیس کی مرثیہ نگاری کا اجمالی جائزہ پیش کیجئے۔

میر انیس کی شناخت کس صنف شاعری سے ہے۔

میر انیس سے پہلے انیس کا تخلص کیا تھا۔

23.8 فرہنگ

لفظ	معنی
اَجداد	باپ دادا، پرکھے
فصاحت	خوش گوئی، خوش کلامی
بلاغت	فصح کلام، حسب موقع گفتگو
عہدِ زریں	سنہری دور
مطرب	گانے ولا
ورثہ	میراث
دامنِ صحرا	جنگل کا آنچل
رزم گاہ	میدان جنگ
اَطلس	ایک قسم کا ریشمی کپڑا
خجل	شرمندہ، نادم
نرغہ	ہجوم (کربلا میں یزیدی فوج کا گھیرا مراد ہے)
غم خوار	ہمدرد، دکھ درد کا شریک
آبِ خنک	ٹھنڈا پانی
غش	بے ہوشی

لفظ	معنی
مسافت	فاصلہ
وحیدعصر	یگانہ، یکتا
سرخرو	کامیاب،خوش
اہل بیت	آپ رسولؐ کے کنبہ کے لوگ
مشہد	شہید ہونے کی جگہ
مَسکن	رہنے کا مقام
سحر	'صبح'
صحرا	جنگل
مقتل	قتل کرنے کی جگہ
بَین	مردے کی خوبیاں بیان کر کے رونا،نوحہ
روزِ عاشورہ	امام حسین کے شہید ہونے کا دن
شاہ تشنہ کام	پیاسے حسین (میدان کربلا میں)

کتب برائے مطالعہ

۱۔	میر انیس حیات اور شاعری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۱۹۷۶ لکھنؤ
۲۔	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۱۹۲۵ لکھنؤ
۳۔	اردو مرثیہ کا ارتقا	مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۹
۴۔	اردو مرثیہ کی روایت	مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۹
۵۔	اردو مرثیہ نگاری	ام ہانی اشرف	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۷
۶۔	انیس (سوانح)	نیر مسعود قومی کونسل برائے فروغ	اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۲
۷۔	اسلاف انیس	سید مسعود حسین رضوی ادیب	کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۷۰
۸۔	انتخاب مراثی	اتر پردیش اردو اکاڈمی	لکھنؤ ۲۰۱۰
۹۔	واقعات انیس	مہدی حسین احسن لکھنوی،	اردو پبلیشرز لکھنؤ ۱۹۷۵
۱۰۔	گلدستۂ انیس	مرتبہ: سید صغیر حسین نقوی	اردو پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۷۶
۱۱۔	رباعیات انیس	مرثیہ علی جواد زیدی	اردو ترقی بیورو ئی دہلی ۱۹۸۵
۱۲۔	روح انیس	مرثیہ مسعود حسین رضوی ادیب	کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۴
۱۳۔	انیس شناسی	فضل امام	لکھنؤ ۱۹۸۰
۱۴۔	روح انیس	مرتبہ: انیس اشفاق	ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی ۲۰۱۱ء
۱۵۔	اردو مرثیہ کی جمالیات	عابد حسین حیدری	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۰ء
۱۶۔	انیس کے سلام	علی جواد زیدی	قومی اردو کونسل، نئی دہلی ۲۰۱۷ء

اکائی 24 مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات، مرثیہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم
(کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے: منتخب بند)

ساخت

24.1 اغراض و مقاصد
24.2 تمہید
24.3 مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات، مرثیہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم
24.3.1 مرزا سلامت علی دبیرؔ کے سوانحی احوال و کوائف
24.3.2 مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری
24.3.3 متن کی تدریس و تفہیم
24.3.4 ماحصل
24.4 آپ نے کیا سیکھا؟
24.5 اپنا امتحان خود لیجیے
24.6 سوالوں کے جوابات
24.7 فرہنگ
24.8 کتب برائے مطالعہ

24.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے متعارف ہوں گے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری سے بحث کریں گے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوں گے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مشہور مرثیہ 'کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے' کے منتخب بند کی قرأت کریں گے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مشہور مرثیہ 'کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے' کے منتخب بند کی تشریح کو سمجھیں گے۔

24.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ اُردو کے مشہور مرثیہ نگار میر انیسؔ کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کے مشہور مرثیہ 'جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے' کے منتخب بند کی قرأت کی اور اس کی تشریح کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے دوسرے معروف مرثیہ نگار مرزا سلامت علی دبیرؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے متعارف ہوں گے، ان کی مرثیہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوں گے، ان کے مشہور مرثیہ 'کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے' کے منتخب بند کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح کو سمجھیں گے۔

24.3 مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات، مرثیہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم

24.3.1 مرزا سلامت علی دبیرؔ کے سوانحی احوال و کوائف

مرزا دبیر کا پورا نام سلامت علی اور تخلص دبیرؔ ہے۔ والد کا نام مرزا غلام حسین ہے۔ دبیرؔ کی پیدائش ۲۹/ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں ہوئی۔ سات سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ سولہ برس کی کم عمر میں انھوں نے عربی و فارسی علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ چوں کہ لکھنؤ کی فضا عزاداری کی محفلوں کی وجہ سے مرثیہ نگاری کے لیے سازگار تھی، اس لیے دبیرؔ بھی اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بچپن ہی سے دورانِ تعلیم انھوں نے مرثیہ کہنا شروع کر دیا۔ ان کی موزوں طبیعت کو دیکھ کر ان کے والد ۱۸۱۵ء میں انھیں اس وقت کے مشہور مرثیہ گو شاعر میر مظفر حسین ضمیر کے پاس لے گئے۔ میر مظفر حسین ضمیر نے ان کی شاعری کے جوہر کو پہچان کر اپنی شاگردی میں رکھ لیا جس سے ان کے فن میں بڑا نکھار پیدا ہوا۔ اس طرح ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۱۵ء میں ہوا۔ ۱۸۵۷ء تک لکھنؤ میں مقیم رہے۔ ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد کا رُخ کیا۔ ۱۸۷۴ء میں ضعف بصارت کی شکایت لاحق ہوئی۔ چنانچہ نواب واجد علی شاہ کی خواہش پر علاج کی غرض سے کلکتہ کا سفر کیا اور مٹیا برج میں مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اُردو کے اس مایہ ناز مرثیہ گو شاعر نے ۶/ مارچ ۱۸۷۵ء کو لکھنؤ میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے مکان میں مدفون ہوئے۔ مرزا دبیرؔ کا خاص میدان اگرچہ مرثیہ تھا لیکن انھوں نے غزل، رُباعی، قطعہ اور سلام جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں محققین کا اختلاف ہے۔ ایس اے صدیقی کے مطابق ان کے مرثیوں کی کل تعداد ۶۷۵ ہے جس میں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سبھی مرثیے شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ان کی تعداد تین ہزار بتائی ہے۔ 'شمس الضحیٰ' اور 'ردالموازنہ' کے مصنفین نے دو ہزار بتائی ہے۔ ان اختلافات سے قطع نظر، اس میں کوئی شک نہیں کہ دبیرؔ نے بڑی تعداد میں مرثیے لکھے ہیں۔

دبیرؔ سے پہلے مرثیہ نگاری کی محفلوں میں دلگیرؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ، خلیقؔ، سکندر اور سید محمد تقی کی دھوم تھی۔ اس سے قبل میر و سودا جیسے شاعروں نے بھی مرثیے کہے لیکن اس عہد میں اس صنف کو پختگی حاصل نہیں ہوئی۔ سوداؔ نے موضوعات اور ہیئت کے لحاظ سے اس صنف کو نکھارنے کا کام کیا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں لکھا لیکن اس وقت تک مرثیے میں رزمیہ عناصر خال خال ہی نظر آتے تھے۔ مرثیہ کو ادبی مقام میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کے عہد میں حاصل ہوا۔ ان حضرات نے مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت کو اختیار کیا۔ میر ضمیر نے مرثیوں کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ اور سراپا نگاری کا اضافہ کیا اور ان کی ترتیب مقرر کی۔ اس کے بعد مرثیوں میں سیرت نگاری، جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری کی طرف مرثیہ گو شعرا توجہ دینے لگے۔

میر ضمیر کی انھیں خدمات کی وجہ سے مسعود حسین خاں نے کہا ہے کہ ''اگر ضمیر نہ ہوتے تو دبیرؔ کا وجود ہوتا اور نہ انیس کا'' مرزا دبیرؔ کو میر ضمیر کا جانشین کہا جاتا ہے۔ انھوں نے میر ضمیر کی روایت کی توسیع کی اور اپنی فن کارانہ و علمی صلاحیتوں کی بدولت صنفِ مرثیہ کو اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

24.3.2 مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری

مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۳ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور میں انھوں نے اگر چہ مروجہ مضامین کی پیروی کی ہے لیکن ان کے خلاقانہ ذہن نے یہاں بھی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ واقعات اور روایات بیان کرتے وقت انھوں نے حزنیہ عنصر کو نمایاں طور پر جگہ دی ہے۔ اس دور کے مرثیوں میں ان کے یہاں روایات اور واقعات کے بیان پر زیادہ زور پایا جاتا ہے۔ لکھنوی معاشرے میں اس وقت تک چوں کہ داستانوں اور قصے کہانیوں کا زور تھا اور فوق فطری کرداروں کی طرف عوام کی طبیعت مائل تھی۔ چنانچہ دبیرؔ بھی اس روش سے محفوظ نہ رہ سکے۔ دبیر نے مرثیوں میں اثر انگیزی پیدا کرنے کے لیے نئے نئے واقعات گڑھ کر مرثیہ میں شامل کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے واقعات اور روایات کو نظم کرتے وقت فوق فطری واقعات کو بھی اپنے مرثیوں میں جگہ دی۔ ابتدائی دور کے ان کے مرثیوں کا بنیادی مقصد اظہارِ فن نہیں بلکہ اہلِ بیت سے اظہارِ عقیدت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کے ان کے مرثیوں میں عربی کے بھاری بھرکم الفاظ اور حشو و زائد کی مثالیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں اور زبان و بیان کی وہ پختگی نظر نہیں آتی جو بعد کے مرثیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ابتدائی دور کے مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

پانی اس بزم میں جب مانگتے ہیں اہل عزا نام سے پانی کے روتی ہیں جناب زہرا
اہل مجلس سے یہ کہتی ہیں بہ فریاد و بکا مومنو پانی کے ساغر کو سمجھ کر پینا
تشنہ لب قتل ہوا فاطمہ کا جانی ہے
میرے بیٹے نے نہ پایا یہ وہی پانی ہے

دبیرؔ نے اس بند کو مجلسِ عزا کی فضیلت کے فوراً بعد بیان کیا ہے۔ اس سے دبیرؔ کے ماتمی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ جہاں بھی موقع پاتے ہیں، بکائیہ مضامین نظم کر دیتے ہیں۔ مرزا دبیرؔ فرطِ جذبات میں مکالمہ نگاری کی جزئیات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اسی بند میں ٹیپ کے پہلے شعر میں دبیرؔ نے واحد غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے جب کہ دوسرے مصرعے میں واحد متکلم کے صیغے کو برتا ہے۔

دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا دوسرا دور ۱۸۳۳ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ دور مرزا دبیرؔ ہی کے لیے نہیں بلکہ اُردو مرثیہ نگاری کے لیے بھی اہم ہے۔ اس دور میں دبیرؔ نے مرثیہ نگاری کے متعینہ اجزاے ترکیبی کی پیروی کی ہے تاہم اس دور کے ان کے مرثیوں میں بھی ان کے ابتدائی دور کے مرثیوں کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ مضمون آفرینی دبیرؔ کے مرثیوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مسیح الزماں کے بقول انھوں نے چہرہ اور سراپا نگاری میں اس سے خوب کام لیا ہے۔ مرزا دبیر جب رخصت، شہادت اور دوسرے واقعات کو نظم کرتے ہیں تو وہ سادہ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے کم ہی مرثیے ایسے ہوں گے جن میں مرثیے کے اجزاے ترکیبی کو ترتیب کے ساتھ برتا گیا ہے۔ یہ معاملہ صرف مرزا دبیر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دیگر مرثیہ

نگاروں نے بھی یہی روش اپنائی ہے۔ مرزا دبیر اپنی سہولت کے اعتبار سے اجزاے ترکیبی کو مقدم و مؤخر کر دیتے ہیں اور مرثیے کے مضمون کے لحاظ سے جس جز کو چاہتے ہیں، اسے حذف بھی کر جاتے ہیں۔ مرثیہ کا پہلا جز چہرہ ہوتا ہے۔ مرزا دبیر نے چہرہ میں اس وقت کے رواج کے مطابق عام طور پر موسمِ بہار، طلوع سحر، ہیرو کی تعریف یا مجلس عزا کی اہمیت و فضیلت کو نظم کیا ہے۔ دبیر نے چہرہ میں صنائع و بدائع کا خوب استعمال کیا ہے۔ ان کے چہرہ میں مضمون آفرینی اور خیال بندی کی خوبیاں موجود ہیں۔ دراصل دبیر مرثیے کے بنیادی مقصد سے غافل نہیں ہوتے۔ وہ چہرہ میں 'رثا' کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ چہرہ کی مثال کے طور پر درج ذیل بند ملاحظہ ہو:

سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل　　خورشید یداللہ کی محفل ہے یہ محفل
روشن ہے کہ برج مہ کامل ہے یہ محفل　　دربانی جبریل کے قابل ہے یہ محفل
ہر ذرہ چراغ حرم لم یزلی ہے
حقا کہ یہ دربار حسین ابن علی ہے

مرثیہ کا دوسرا جز سراپا ہوتا ہے۔ دبیر نے اس میں بھی کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے سراپا نگاری کو دو بنیادی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ پہلا مقصد اظہارِ فن اور دوسرا مقصد اہلِ بیت سے عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔ سراپا نگاری کو میر ضمیر نے مرثیہ میں شامل کیا تھا اور سب سے پہلے علی اکبر کی سراپا نگاری کو پیش کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کربلا کے شہیدوں میں وہ سب سے حسین و جمیل تھے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ بعد میں سبھی مرثیہ نگاروں نے اصحابِ کربلا کا سراپا لکھا۔ دبیر نے بھی اس روش کو باقی رکھا اور اصحابِ کربلا کے اہم کرداروں کا سراپا لکھا جن میں امام حسین، علی اصغر، عون و محمد، قاسم اور عباس وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے سراپا نگاری میں صنائع و بدائع اور خیال آفرینی کا جوہر دکھایا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل بند میں علی اکبر کا سراپا ملاحظہ ہو:

صورت گر رخسارہ الفاظ معانی　　لکھتا ہے اب اکبر کا سراپائے جوانی
نازک بدنی، سرو قدی، غنچہ دہانی　　افسردہ دلی، خستہ تنی، خشک زبانی
ترکیب بدن لکھیے جو سامان رقم ہو
انگشت و کف روح الامیں لوح و قلم ہو

مذکورہ بند میں علی اکبر کی سراپا نگاری میں دبیر نے نادر تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کا خوب صورت استعمال کیا ہے اور ان کے ایک ایک شعر سے علی اکبر سے عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے سراپا نگار ہیں۔

مرثیہ کا تیسرا جز رخصت ہے۔ دبیر رخصت کے مضامین بیان کرنے میں بے حد کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حصہ حزنیہ ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ چوں کہ لکھنوی شاعری کی بنیادی خصوصیت نسوانی جذبات کی ترجمانی ہے اور یہاں نسوانی جذبات نگاری کا موقع ہوتا ہے جسے دبیر ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اس لیے ان کے کامیاب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ذیل میں رخصت کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

کب تک نہ منہ پہ لاؤں میں آخر یہ غم خوری　　یہ بات آپ کی مرے دل کو بری لگی
پہلے مرے جگر پہ کیوں نہ پھیر دی چھری　　ہاں تم کو صبر ختم، پسر پر بہادری
عباس کے خیال سے غش کرگئی تھی میں
مجھ سے نہ لی صلاح بھی کیا مرگئی تھی میں
پھر کچھ سکوت کرکے یہ فضہ کو دی صدا　　ناڑا تو ان کی سال گرہ کا نکال لا
لائی جو وہ تو دست مبارک میں خود لیا　　گن گن کے ہر گرہ کو دعا مانگی اور کہا
لوگو میں سمجھی تلخی رنج وملال کو
میٹھا برس شروع ہے بانو کے لال کو

یہ دونوں بند دبیر کی فن کارانہ صلاحیت کی معراج ہیں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ زینب کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ علی اکبر کو ان کی والدہ نے جنگ میں جانے کی اجازت دے دی ہے تو پھوپھی ہونے کے ناطے انھیں یہ بات ناگوار گزری کہ ان کے مشورے کے بغیر انھوں نے یہ فیصلہ کیوں لے لیا؟ بانو سے گفتگو کرتے وقت زینب نے جو طنزیہ جملے کہے ہیں، اس میں ہندوستانی معاشرت کی جھلک موجود ہے جس میں بھاوج اور نند کے رشتوں کی نزاکت کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ سال گرہ کا ناڑا نکالنا، اس کے گرہوں کو گن گن کر دعا کرنا اور میٹھا برس جیسے الفاظ ومحاورات خالص ہندوستانی معاشرت کے نمونے ہیں۔ حالاں کہ کلیم الدین احمد نے اُردو مرثیوں میں ہندوستانی ماحول کی عکاسی کو عیب شمار کیا ہے لیکن مسعود حسن رضوی ادیب اور دوسرے ناقدین نے اسے عیب نہیں مانا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پُر اثر بنانے کے لیے مرثیہ نگاروں نے ہندوستانی فضا سازی کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مرثیہ نگار منظر نگاری اور تہذیبی معاشرت میں وہی چیزیں پیش کریں گے جن چیزوں کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دبیر ہندوستانی معاشرت (لکھنؤ کے ماحول اور رسم ورواج) کے پروردہ تھے۔ اس وجہ سے ان کے مرثیوں کے واقعات اگرچہ عرب کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں تہذیب ومعاشرت ہندوستانی ہے۔ یہ معاملہ دبیر کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ انیس اور اُردو کے دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں بھی ہمیں یہی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔

مرثیہ کا ایک اہم جز آمد ہے جس میں ہیرو کا اہل خانہ سے اجازت لے کر میدانِ کارزار میں آنے کا بیان ہوتا ہے۔ اس میں ہیرو کی شجاعت، بہادری، جاہ وجلال کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کی آمد سے دشمنوں پر کیا اثر طاری ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے آمد مرثیہ کا مدحیہ جز بھی کہلاتا ہے۔ چوں کہ یہیں سے جنگ کا بیان بھی شروع ہوتا ہے، اس وجہ سے یہ حصہ مدحیہ رزمیہ بھی بن جاتا ہے۔ دبیر نے بھی اپنے کئی مرثیوں کی ابتدا آمد سے کی ہے۔ چوں کہ یہاں رخصت کی طرح جذبات نگاری، محاکات اور انسانی نفسیات کے بیان کا محل نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے دبیر نے اپنے مرثیوں کے آمد والے حصے میں مضمون آفرینی اور مبالغے سے فضا سازی کی ہے۔ وہ ہیرو کی تعریف میں ہر وہ چیز پیش کرتے ہیں جس سے وہ ظاہر کرسکیں کہ ان کا ہیرو سب پر فائق ہے۔ اس مبالغہ آرائی کو اگرچہ عقل تسلیم نہ کرے لیکن مذہبی عقیدت کی وجہ سے تسلیم کرلی جاتی ہے۔ میدان جنگ میں حضرت حسین کی آمد کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

محشر کی ہے آمد کہ قیامت کی ہے آمد　　یا دل برخاتون قیامت کی ہے آمد
غل ہے کہ شہنشاہ اولوالعزم یہی ہے
جاں بخش جہاں بخش دم رزم یہی ہے

وہ پیش تھے لشکر میں وہ اب زیر و زبر ہیں　　اب ذہن میں نے ظلم کے پیشے نہ ہنر ہیں
تنہا ہے ہر اک تن کہ نہ دل ہیں نہ جگر ہیں　　سر ڈھونڈ رہا ہے کہ مرے ہوش کدھر ہیں
نے جوق ہے نہ بوق نہ دستہ نہ تمن ہے
معمور فقط ہیبت شبیر سے رن ہے

یہاں پر دبیرؔ نے حضرت حسین کی آمد سے مخالف لشکر میں پیدا ہوئی گھبراہٹ کو پیش کیا ہے۔ الفاظ کے دروبست سے ایک خاص قسم کا طنطنہ اور دبدبہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔

رجز بھی مرثیہ کا انتہائی اہم جز ہے لیکن دبیرؔ اپنے رجزیہ اشعار میں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ دراصل دبیرؔ نے رزمیہ عنصر سے زیادہ شخصیت کے خدوخال واضح کرنے پر اپنا زور صرف کیا جس کی وجہ سے ان کے رجزیہ اشعار میں وہ زور پیدا نہیں ہوسکا۔ بہ طور نمونہ دبیرؔ کے یہاں رجز کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

میں ہوں مکین دوش نبی ہر مکاں کا فخر　　شیر خدا کا لال ہوں نوشیرواں کا فخر
کوثر کی آبرو ہوں اور اہل جناں کا فخر　　کعبے کا نور عرش کا اوج آسماں کا فخر
نام و نسب سے قدر عجم اور عرب کی ہے
رونق ہماری ذات سے نام ونسب کی ہے

مذکورہ بالا بند میں دبیرؔ نے حضرت حسین کی شجاعت اور بہادری پر ان کی امامت کو فوقیت دیتے ہوئے ان کی زبان سے جو رجزیہ کلام ادا کرایا ہے، اس سے ان کی شخصیت کا ایک ہی پہلو واضح ہوتا ہے جب کہ دوسرا پہلو یعنی دلاوری اور شجاعت کا بیان خال خال ہے اور یہی کمی ان کے رجزیہ اشعار کی معنویت کو کم کرتی ہے۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں رزم/جنگ کا جز بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دبیرؔ کو چوں کہ حزنیہ مضامین سے زیادہ لگاؤ تھا، اس لیے رزمیہ مضامین کے بیان میں انھیں بہت زیادہ کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ ان کی رزمیہ شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ جہاں انھوں نے جنگ کی منظر کشی، فوجوں کی تیاری، ناکہ بندی، محاذ آرائی، نیزہ بازی اور تیر اندازی وغیرہ کا منظر پیش کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کے یہاں جزئیات نگاری میں اگرچہ خامیاں ہیں لیکن کئی جگہ انھوں نے روایات کا سہارا لے کر واقعہ نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ دبیرؔ کے یہاں عقیدت میں ہیرو اور مخالف کی جو تصویر کشی کی گئی ہے، وہ اگرچہ اکہری ہے لیکن یہ اس دور کی ہیرو پرستی کے مزاج کے مطابق ہے۔ دوسری طرف ہیرو کی کردار نگاری میں داستانوں کے اثرات کی شمولیت نے اسے ایک فوق فطری کردار بنا دیا ہے۔ دبیرؔ کی رزمیہ شاعری کا دوسرا حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے شمشیر اور

گھوڑے وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی زبان و بیان کا جادو دکھانے میں کام یاب ہوئے ہیں۔ شمشیر کی تعریف میں ان کا ایک بند ملاحظہ ہو:

ناز و ادا سے لیلیٰ فتح و ظفر چلی　　مجنوں ہزاروں ہوگئے اس کے جدھر چلی
فوج عدو کی موت کی لے کر خبر چلی　　مغرور خود سروں پر جو تیغ دوسر چلی
شفاف وصاف جنگ کا میدان کر دیا
توڑے پر صفوں کو پریشان کر دیا

مذکورہ بالا بند میں تلوار کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ لاجواب ہے۔ انھوں نے تلوار کی صفت میں ایسے نادر مضامین بیان کیے ہیں جو انتہائی موثر ہیں۔

مرثیہ کا ایک جز شہادت ہے۔ دبیر کے ناقدین کا خیال ہے کہ واقعات کے تسلسل کو برقرار نہ رکھنے اور واقعات کو مناسب رنگ نہ دے پانے کی وجہ سے دبیرؔ شہادت کے بیان میں زیادہ تر کام یاب نہیں ہو سکے ہیں۔ دراصل شہادت کا موضوع ہی بہت نازک ہے۔ مرثیہ نگار کو ہیرو کی شجاعت اور بہادری کے فوراً بعد اس کو جامِ شہادت کا پیالہ نوش کرتا ہوا دکھانا پڑتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے جس کی تلوار دشمن کے صفوں کو تہ تیغ کر رہی ہوتی ہے، وہ اچانک مظلوم کے کردار میں آجاتا ہے۔ یہ تبدیلی اتنی جلدی ہوتی ہے کہ اس درمیان کسی منطقی عذر کا تلاش کرنا ایک ناگزیر امر بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر دبیرؔ کتابی یا سنی ہوئی روایات کا سہارا لیتے ہیں یا وہ خود سے کچھ تخلیق کر لیتے ہیں۔ ایک مقام پر وہ حضرت حسین کی شہادت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ دشمن نے حضرت حسین کی بہادری اور تلوار بازی سے پریشان ہو کر ایک چال چلی کہ خیمے میں جا کر آواز دی جائے کہ شبیر شہید ہو گئے۔ چنانچہ یہ سن کر زینب باہر نکل کر آواز دیں گی جسے سن کر حضرت حسین مزید حملہ نہ کر سکیں گے اور موقع کو غنیمت جان کر انھیں قتل کر دیں گے۔ ذیل میں بند ملاحظہ ہو:

القصہ یہ مکاروں نے بچنے کی کی تدبیر　　زینب سے کہے کوئی کہ مارے گئے شبیر
سر پیٹتی جو رن میں نکل آئے گی ہمشیر　　پھر فوج پہ حملہ نہ کریں گے شہ دل گیر
سیدانیوں میں دھوم قیامت کی مچے گی
گریہ نہ کیا جان کسی کی نہ بچے گی

چنانچہ خیمے میں جا کر آواز دی گئی۔ یہ سن کر زینب باہر نکل آئی اور آواز لگائی کہ بھائی اگر تم زندہ ہو تو آواز دو۔ اتنے میں ندا آئی:

میں جانتا ہوں میرے لیے دکھ میں پڑے ہو
لو آؤ مرے عرش کے پہلو میں کھڑے ہو

جیسے ہی حضرت حسین زینب کی آواز سن کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انھیں اپنی پناہ میں بلاتے ہیں۔ اتنے میں ظالموں کو موقعہ ہاتھ آجاتا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔ ظالموں کی کام یابی کے بعد شعر کا دوسرا پہلو بھی ہو سکتا ہے یعنی کہ غیب سے آواز کا آنا کہ اب آپ ہمارے پاس چلے آئیں کیوں کہ آپ ہماری راہ میں بہت مشکلات اٹھا چکے ہیں۔ اسی طرح کئی جگہ پر مرزا دبیرؔ کے گڑھے ہوئے واقعات کی مثالیں

موجود ہیں۔

مرثیہ کا آخری جز بین یعنی آہ و بکا ہے۔ چوں کہ دبیر کی طبیعت رثا کے مضامین کے لیے زیادہ موزوں تھی، یہی وجہ ہے کہ یہ حصہ ان کے یہاں زیادہ ترقی یافتہ شکل میں سامنے آتا ہے۔ انھوں نے اہلِ بیت کی مظلومیت کے واقعات کو بیان کرتے وقت جو فضا سازی کی ہے، اس کی وجہ سے وہ حصے بھی بین کے درجے میں آجاتے ہیں۔ مثلاً یزید کے دربار میں اہلِ بیت کی حاضری اور قید خانے میں اہلِ بیت کی مشکلات کا بیان وغیرہ۔ بین کے معاملے میں عام طور پر عورتوں کے جذبات کی ترجمانی سے گریہ وزاری کی فضا قائم کی جاتی ہے۔ ایسے میں دبیر نے لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے لکھنوی آدابِ معاشرت کو پیش نظر رکھا ہے۔ بین کرتے وقت ایک متوسط لکھنوی گھرانے کی عورت کے تمام عادات واطوار کو انھوں نے اپنے مرثیوں میں جگہ دی ہے جس سے واقعے کی اجنبیت ختم ہوگئی اور سامعین کی طبیعت کو بین کے لیے مائل کرنے میں آسانی ہوگئی۔ دبیر کے 'آہ و بکا' کے مقامات کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا درجہ وہ ہے جس میں انھوں نے شمالی ہند کے مرثیوں کی پیروی کی ہے۔ اس قسم کے بین میں انھوں نے ایسے واقعات بھی نظم کر دیے ہیں جو حقیقت سے دور ہیں۔ دوسرے درجے میں ان کے وہ مرثیے آتے ہیں جو ترقی یافتہ دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں پر دبیر کا قلم پوری آب و تاب کے ساتھ رواں نظر آتا ہے۔ انھوں نے مجلسی آہنگ کے ساتھ ادبی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ دبیر کے ایک مرثیہ سے بانو کا بین ملاحظہ کیجیے:

خدا کے واسطے اکبر کو ڈھونڈ لاؤ کوئی　　جگر میں آگ لگی ہے ارے بجھاؤ کوئی
یہ کیا غضب ہوا اے صاحبو بتاؤ کوئی　　نجف سے حیدر کرار کو بلاؤ کوئی
پسینہ آتا ہے اور جی نڈھال ہوتا ہے
پسر کے غم میں یہی سب کا حال ہوتا ہے

مذکورہ بالا بند میں ایک ماں کے درد و غم کی حقیقی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس درد و غم کے اندر جو سچی تاثیر ہے، اس کے لیے کسی خاص عقیدت کی ضرورت نہیں۔ درد و غم کی اس کیفیت کو دبیر نے اپنے قوتِ اظہار سے لافانی بنا دیا ہے۔ تیسرے درجے میں وہ حصے ہیں جو اگرچہ بین نہیں ہیں لیکن حزنیہ مضامین کی وجہ سے بین کے قریب ہیں۔ دراصل یہ وہ دردانگیز مرقعے ہیں جو خاص مواقع پر دبیر نے پیش کیے ہیں۔ ایک قید خانے میں بانو کی تصویر ملاحظہ کیجیے:

ماں کو سواد شب نظر آیا جو برملا　　اصغر کو قید خانے میں دل ڈھونڈنے لگا
بے اختیار دوڑی سوئے دروں ننگے پا　　زینب لپٹ کے بولی کہ بھابی یہ کیا کیا
زنداں سے بھی اسیر کہیں جانے پاتے ہیں
وہ بولی کیا کروں علی اصغر بلاتے ہیں
اس وقت یاد آتی ہے اصغر کی واردات　　میدان سونا لاشے پہ لاشہ اندھیری رات
جنگل میں جاگا ہوگا جو معصوم نیک ذات　　پہلو میں ڈھونڈا ہوئے گا مجھکو اٹھا کے ہات

جانے دو مجھ کو جانے دو اب جان جاتی ہے
اصغر کے رونے کی مجھے آواز آتی ہے

یہاں ایک شہید بیٹے کے لیے ایک ماں کے جذبات کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، اس سے ان کی مظلومی و بے کسی عیاں ہے۔ یہ حصہ اگر چہ بین کا نہیں ہے لیکن اس میں موجود درد وغم کی کیفیت کو ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے۔

دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دبیرؔ اپنے پسندیدہ موضوع میں زیادہ کام یاب ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری جگہوں پر وہ اس طرح سے کام یاب نہیں ہو سکے ہیں۔ موضوعاتی سطح پر انھوں نے حزنیہ مضامین میں زیادہ زور صرف کیا ہے جہاں انھوں نے نادر تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کا خوب صورت استعمال کر کے مرقع نگاری اور زبان دانی کا جوہر دکھایا ہے۔

24.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

(کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے: منتخب بند کی قرأت)

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے — سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعۂ افلاک کے در بند — جلا دفلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند — سیارے ہیں غلطاں صفت طائر پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت — نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
چہرے پہ مہ عید کی بے جا ہے اشارت — وہ عید کا مژدہ ہے یہ حیدرؑ کی بشارت
ابرو کی مہ نو میں نہ جنبش ہے نہ ضو ہے
اک شب وہ مہ نو ہے یہ ہر شب مہ نو ہے

منہ غرق عرق دیکھ کے خورشید ہوا تر — ابرو سے ٹپکتا ہے نرا تیغ کا جوہر
آنکھوں کا عرق روغن بادام سے بہتر — عارض کا پسینہ ہے گلاب گل احمر
قطرہ رخ پرنور پہ ڈھلتے ہوئے دیکھو

عطر گل خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

اس رخش کو عباسؑ اڑاتے ہوئے آئے　　کوس لمن الملک بجاتے ہوئے آئے
تکبیر سے سوتوں کو جگاتے ہوئے آئے　　اک تیغ نگہ سب پہ لگاتے ہوئے آئے

بے چلے کے کھینچے ہوئے ابرو کی کماں کو
بے ہاتھ کے تانے ہوئے پلکوں کی سناں کو

دو چاند کو کرتی ہے اک انگشت ہماری　　ہے مہر نبوت سے ملی پشت ہماری
ہے تیغ ظفر وقتِ زدوکشت ہماری　　سو گرز قضا ضربت یکمشت ہماری

قدرت کے نیستان کے ہم شیر ہیں ظالم
ہم شیر ہیں اور صاحب شمشیر ہیں ظالم

احمد ہے چچا میرا پدر حیدرؑ صفدر　　وہ کل کا پیمبر ہے یہ کونین کا رہبر
اور مادرِ زینبؑ کی ہے لونڈی مری مادر　　بھائی مرا اک عون دو عبداللہ و جعفر

اور شپر و شبیر ہیں سردار ہمارے
ہم ان کے غلام اور وہ مختار ہمارے

بجلی گری بجلی پہ اجل ڈر کے اجل پر　　اک زلزلہ طاری ہوا گردوں کے محل پر
سیارے ہٹے کر کے نظر تیغ کے پھل پر　　خورشید تھا مریخ یہ مریخ زحل پر

یہ ہول دیا تیغ درخشاں کی چمک نے
جو تاروں کے دانتوں سے زمیں پکڑی فلک نے

مرحب سے مخاطب ہوئے عباسؑ دلاور　　شمشیر کے مانند سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے کہ اک ضرب میں دو ہو تو سراسر　　پر اس میں عیاں ہوں گے نہ جوہر مرے تجھ پر

لے روک مرے وار ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کروں گا ابھی اظہار ہنر ہے

مشک و علم و تیغ کو بائیں پہ سنبھالا　　اور جلد چلا عاشق روئے شہ والا
پر ابن طفیل آگے بڑھا تان کے بھالا　　برچھی کی انی سے تو کیا دل تہہ و بالا

اور تیغ کی ضربت سے جگر شاہ کا کاٹا
وہ ہاتھ بھی فرزند یداللہ کا کاٹا

سقے نے کئی بانہوں پہ مشکیزہ کو رکھ کر مانند زباں منہ میں لیا تسمہ سراسر
ناگاہ کئی تیر لگے آگے برابر اک مشک پہ اک آنکھ پہ اور ایک دہن پر
مشکیزے سے پانی بہا اور خوں بہا تن سے
عباسؑ گرے گھوڑے سے اور مشک دہن سے
ناگاہ پھرا پیٹتا منہ کو وہ پریشاں زینبؑ نے کہا خیر تو ہے میں ترے قرباں
چلایا کہ خادم کی یتیمی کا ہے ساماں بھیا علی اکبر نے ابھی پھاڑا گریباں
بن باپ کا بچپن میں ہمیں کر گئے بابا
مردے سے لپٹتے ہیں چچا مر گئے بابا
یہ غل تھا جو مولا لیے مشک و علم آئے خیمہ میں کمر پکڑے امام امم آئے
اور گرد علم بال بکھیرے حرم آئے زینبؑ سے کہا شہ نے بہن لٹ کے ہم آئے
بھائی کے یتیموں کی پرستار ہو زینبؑ
تم مہتمم سوگ علمدار ہو زینب

عزیز طلبا! ابھی آپ نے مرزا سلامت علی دبیرؔ کے جس مشہور مرثیے کے منتخب بند کی قرأت کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

مذکورہ بند مرزا سلامت علی دبیرؔ کے ایک مشہور مرثیے سے لیے گئے ہیں جس میں شاعر نے کربلا کے اس تاریخی واقعے کو بیان کیا ہے کہ یزیدی فوج نے حسینی فوج کے لیے پانی بند کر دیا تھا۔ لوگ پیاس سے بے حال تھے۔ ایسے میں حضرت عباس دشمنوں کی پرواہ کیے بغیر پانی لینے کے لیے نکل پڑے۔ دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ دریا تک بھی پہنچ گئے اور مشکیزہ میں انھوں نے پانی بھی بھر لیا لیکن یہ سوچ کر خود پانی نہیں پیا کہ لشکر میں دوسرے لوگ پیاسے ہیں۔ چنانچہ واپسی میں دشمن کی فوج نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور شہید کر دیا۔ حضرت عباس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نہایت حسین و جمیل تھے۔ انھیں ماہ بنی ہاشم بھی کہا جاتا ہے۔ وہ اتنے دراز قد تھے کہ جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو ان کے قدم زمین کو چھوتے تھے۔ وہ نہایت جری اور بہادر انسان تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کو زور آزمائی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یوم عاشورہ کے دن وہی حسینی لشکر کے علم بردار تھے۔ ان کے سراپے اور شجاعت و بہادری کو اس مرثیے میں فنی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ اُردو مرثیہ کا ایک اہم جز چہرہ ہے۔ 'چہرہ' میں مرثیہ نگار کو مضامین کے انتخاب کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ اسی آزادی کا فائدہ اٹھا کر مرزا دبیر نے 'آمد' کے مضامین سے ہی اس مرثیے کی ابتدا کی ہے۔ مرثیے کے پہلے بند میں حضرت عباس کے میدان میں آنے کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ ان کی آمد کی خبر سن کر پورا میدانِ جنگ خوف سے لرزنے لگا۔ ہیبت کا یہ عالم تھا کہ تک کہ رستم جیسا پہلوان قبر کے اندر اپنے کفن میں کانپنے لگا، زمانے کے جتنے سلاطین تھے، ان کے محلوں میں زلزلہ برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ آسمان بھی اس منظر کو دیکھ کر لرز اٹھا۔ حضرت علی کے بیٹے کے ہاتھ میں تلوار کو دیکھ کر حضرت جبرئیل پر بھی جو چار اہم برگزیدہ فرشتوں میں سے ہیں، لرزہ طاری ہو گیا۔

دبیرؔ نے اس پہلے بند میں ایسے پُر شوکت الفاظ استعمال کیے ہیں کہ حضرت عباس کی بہادری اور شجاعت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ پُر شکوہ الفاظ اور صنعتوں کا ہنرمندانہ استعمال اس بند کی خوب صورتی میں چار چاند لگاتا ہے۔

دوسرے بند میں مختلف ستاروں کا ذکر کر کے میدان جنگ میں حضرت عباس کی آمد سے ہیبت کی جو کیفیت طاری ہوئی، اسے بیان کیا گیا ہے کہ ان کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آسمان کے نو کے نو دروازے بند ہو گئے ہیں۔ آسمان کا جلا دمریخ بھی خود کو قید کر کے نظر بند ہو گیا ہے۔ آسمان کی کمر سے تیسرے آسمانی برج جوزا کا کمر بند کھل گیا ہے۔ سیارے آسمان میں پَر باندھے ہوئے پرندوں کی طرح بے تاب ہو رہے ہیں۔ اس پُر ہیبت منظر کو دیکھ کر آسمان کے منشی عطارد کے ہاتھوں میں بھی ایسا لرزہ طاری ہے کہ اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر گیا ہے اور آسمان کے بادشاہ سورج کے ہاتھ سے بھی علم چھوٹ گیا ہے۔ یعنی حضرت عباس کی ہیبت صرف اہلِ زمین تک محدود نہ تھی بلکہ افلاک میں بھی اس کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس بند میں دبیرؔ کی شاعرانہ صناعی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے میدان جنگ میں حضرت عباس کی آمد کا نقشہ کھینچتے ہوئے تمام موجودات کو اس میں سمیٹ لیا ہے۔ یہاں دبیرؔ نے اپنی علمی قابلیت کا اظہار کرنے کے لیے علم نجوم سے تعلق رکھنے والے الفاظ و تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ 'بند' کی تکرار نے بھی ایک خاص طرح کی فضا سازی میں معاونت کی ہے جس سے ہیرو کی شان و شوکت اور بہادری کی نہایت پُر شکوہ شبیہ قائم ہوتی ہے۔

مذکورہ بند میں سے تیسرے بند میں حضرت عباس کے سراپے کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ کربلا کی روایات کے مطابق حضرت عباس بہت خوب صورت تھے۔ اُردو مرثیہ میں ان کی سراپا نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ اس بند میں حضرت عباس کے سراپے کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر نرگس سے حضرت عباس کی آنکھ کی تشبیہ دی جائے تو یہ ان کی آنکھوں کی توہین ہوگی کیوں کہ نرگس میں نہ پلکیں ہیں اور نہ بینائی ہے جب کہ حضرت عباس کی آنکھوں میں خوب صورت پلکیں ہیں اور ان کی آنکھیں قوت بینائی سے معمور ہیں۔ ان کے چہرے کو چھوڑ کر عید کے چاند کی طرف دیکھنا بے کار ہے کیوں کہ آسمان میں نکلنے والا چاند اگر عید کی خوش خبری دیتا ہے تو آپ کا رخ انور حیدر کرار کی بشارت دیتا ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں عید کے چاند اور حضرت عباس کے رخ انور کا موازنہ کرتے ہوئے مزید کہا گیا ہے کہ نئے مہینہ کے چاند میں ابرو کی جنبش نہیں ہے اور نہ ہی وہ روشنی ہے جو آپ کے رُخ انور سے عیاں ہے۔ یہ چاند صرف ایک رات کے لیے نیا چاند ہے جب کہ یہ ہر رات نیا چاند ہے۔ پہلے مصرعہ میں آنکھ کی مناسبت سے عین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کو صنعت تجنیس کہتے ہیں۔ اس بند میں مرزا دبیرؔ نے صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے حسین استعمال کے ذریعے حضرت عباس کے سراپے کو بیان کرنے میں غیر معمولی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

مذکورہ بند میں سے چوتھے بند میں بھی حضرت عباس کا سراپے کو بیان کیا گیا ہے کہ پسینہ سے تر آپ کے رُخ انور کو دیکھ کر سورج شرم سے پانی پانی ہو گیا ہے۔ آپ کی ابرو یعنی بھوئیں سے پسینہ ٹپکتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلوار سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کا پانی روغن بادام سے بہتر ہے۔ آپ کے رُخسار کا پسینہ گویا سُرخ گلاب کا عرق ہے۔ آپ کے رُخ انور پر پسینہ کے قطرے ڈھلتے ہوئے دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے کہ سورج مکھی کا عرق نکلتے ہوئے دیکھنا۔ پہلے مصرعے میں غرق اور عرق میں صنعت تجنیس ہے۔

مذکورہ بند میں سے پانچویں بند میں میدان جنگ میں حضرت عباس کی آمد کے منظر کو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عباس اپنے گھوڑے کو تیز رفتاری سے میدان جنگ میں لمن الملک یعنی آج کس کی بادشاہت ہے، کا نقارہ بجاتے ہوئے، اپنی تکبیر کی آواز سے سوتے ہوئے لوگوں کو جگاتے ہوئے،

اپنی تلوار جیسی سخت نگاہ سب پر ڈالتے ہوئے آئے اور بغیر کسی دھاگے کے اپنی ابرو کی کمان کو کھینچے ہوئے اور بغیر ہاتھ لگائے پلکوں کی تلوار کو تانے ہوئے میدان جنگ میں حاضر ہوئے۔

مذکورہ بند میں سے چھٹا بند رجز کے اشعار پر مشتمل ہے جس میں حضرت عباس اپنے اعلیٰ حسب ونسب کا فخریہ اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہوں جس کی ایک انگلی کے اشارے پر چاند دو ٹکڑے ہوگیا تھا۔ یہاں معجزہ شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔ مہر نبوت سے ہماری پشت ملی ہوئی ہے۔ یعنی میں نبی کے خاندان سے ہوں۔ مہر نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر تھا۔ اس کی مناسبت سے یہاں پشت کا لفظ شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ہماری فاتحانہ تلوار جنگ وجدال کے وقت کے لیے تیار رہتی ہے۔ قضا کے سوگُرز کی وار کے برابر ہمارا ایک وار ہوتا ہے۔ ارے او ظالم سن! ہم قدرت کے جنگل کے شیر ہیں۔ ہم شیر بھی ہیں اور تلوار کے دھنی بھی ہیں۔

مذکورہ بند میں سے ساتویں بند میں بھی حضرت عباس نے اپنی اعلیٰ نسبی کا فخریہ اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے چچا احمد مرسل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور والد حیدر کرار علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ وہ یعنی احمد مرسل اللہ کے پیغمبر ہیں اور یہ یعنی ہمارے والد دونوں جہاں کے سردار ہیں اور میری ماں زینب کی ماں کی خادمہ ہیں۔ عون، عبداللہ اور جعفر میرے بھائی ہیں۔ حضرت حسن اور حضرت حسین ہمارے سردار ہیں۔ ہم ان کے غلام ہیں اور وہ ہمارے مالک ومختار ہیں۔

مذکورہ بند میں سے آٹھواں بند جنگ کے بیان پر مشتمل ہے۔ جنگ / رزم مرثیہ کے اجزاے ترکیبی کا ایک اہم جزو ہے۔ چوں کہ مرزا دبیرؔ کو رزمیہ مضامین کے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اس لیے انھوں نے اس بند میں پُرشکوہ الفاظ کے ذریعے جنگ کے منظر کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اسے آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جنگ کی ہولناکی اتنی سخت تھی کہ بجلی خود بجلی پر گر رہی تھی اور موت خود ڈر کر موت کے اوپر گر رہی تھی۔ یعنی تلواروں کے باہم ٹکرانے سے انسانی لاشیں زمین پر گر رہی تھیں۔ تلواروں اور نیزوں کی کھنک سے آسمان پر زلزلہ طاری ہوگیا۔ تلوار کی دھار کو دیکھ کر سیارے اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ سورج مریخ کی جگہ پر اور مریخ زحل سیارے کی جگہ پر چلا گیا۔ تلوار کی چمک سے ایسا خوف طاری ہوا کہ آسمان نے تاروں کے دانتوں سے زمین کو پکڑ لیا۔ مریخ اور زحل کو علم نجوم میں منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس بند میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنگ کی ہولناکی اتنی سخت تھی کہ میدان جنگ ہی نہیں بلکہ پوری زمین، آسمان اور سیارے، سبھی پر ہیبت طاری تھی۔

مذکورہ بند میں سے نویں بند میں حضرت عباس کی کشادہ دلی کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عباس اپنے مقابل سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں کہ تلوار کی طرح میں سر سے پیر تک جوہر ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ میں ایک ہی وار میں تمہارے دو ٹکڑے کر دوں لیکن اس سے تم پر میری بہادری کا جوہر نہیں کھلے گا۔ اس لیے کہ تم اس کو دیکھنے کے لیے زندہ ہی نہیں رہو گے۔ اس لیے ابھی میں تم کو زخمی نہیں کروں گا بلکہ تلوار بازی کے ہنر کو ظاہر کرنے کے لیے وار کر رہا ہوں۔ اگر تم میں طاقت ہے تو روک لو۔

مذکورہ بند میں سے دسواں بند شہادت کے بیان پر مبنی ہے۔ شہادت بھی اُردو مرثیہ کے اجزاے ترکیبی میں سے ایک اہم جزو ہے۔ شہادت کا بیان مرثیہ کا بہت نازک حصہ ہوتا ہے لیکن مرزا دبیرؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس نازک مرحلے کو بڑی خوبی سے طے کیا ہے۔ اس بند میں حضرت عباس کی شہادت کی منظر کشی نہایت سلیقے اور فنی مہارت سے کی گئی ہے کہ جب ابن ورقہ نے آپ کے دائیں ہاتھ کو شہید کر دیا تو آپ مشکیزے، جھنڈے اور

تلوار بائیں ہاتھ سے سنبھال کر چلے لیکن ابن طفیل نے آگے بڑھ کر برچھی سے آپ کے سینے کو چیر ڈالا۔ تلوار کی وار سے آپ کے جگر کو کاٹ ڈالا اور آپ کے دوسرے ہاتھ جس میں علم اور مشکیزہ تھا، کو بھی کاٹ ڈالا۔

مذکورہ بند میں سے گیارہویں بند میں حضرت عباس کی شہادت کے دردناک منظر کو بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت عباس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تو انھوں نے بانہوں کے سہارے مشکیزے کو اپنے منہ سے پکڑ لیا لیکن اتنے میں کئی تیر ان کو آ کر لگے۔ ایک تیر مشکیزہ پر لگا، ایک آپ کی آنکھ اور ایک آپ کے منہ پر آ کر لگا۔ آخری شعر میں بیان کیا گیا ہے کہ مشکیزے سے پانی اور بدن سے خون بہنے لگا۔ حضرت عباس گھوڑے سے گر پڑے اور مشکیزہ جس میں پانی بھر کر لانے کے لیے انھوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا، منہ سے گر گیا۔

مذکورہ بند میں سے بارہواں بند بین یعنی شہادت کے بعد رنج وغم کے بیان میں ہے۔ بین مرثیہ کا آخری جزو ہے۔ مرزا دبیر کے فن کا جوہر اسی حصے میں کھلتا ہے۔ اس بند میں مرزا دبیر نے رنج وغم کی ایسی مرقع کشی کی ہے کہ پورا ماحول غم میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بند میں حضرت عباس کی شہادت کے بعد اہل بیت کے خیمہ میں بین اور رنج وغم کی مصوری کی گئی ہے۔ جب حضرت عباس کے بیٹے کو بتایا گیا کہ ان کے والد پانی لینے کے لیے گئے ہیں اور جلد ہی پانی لے کر واپس آئیں گے تو اس نے بار بار ندی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اچانک وہ پریشانی کے عالم میں منہ کو پیٹتا ہوا مڑا۔ اس کو اس حال میں دیکھ کر زینب نے کہا میں تجھ پر قربان جاؤں خیریت تو ہے؟ اس نے چلا کر کہا کہ میری یتیمی کا سامان ہو گیا ہے یعنی میں یتیم ہو گیا ہوں۔ وہ دیکھیے علی اکبر بھائی نے اپنا گریبان پھاڑ دیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ میرے بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ گریہ وزاری کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے بابا مجھے بن باپ کے کر گئے۔ میرے چچا مُردے سے لپٹ رہے ہیں۔ میرے بابا مر گئے۔

مذکورہ بند میں سے تیرہویں بند میں بھی بین یعنی رنج وغم کے منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ اہلِ بیت کے خیمے میں ماتم کا شور برپا تھا کہ اسی بیچ حضرت حسین اپنے بھائی عباس کا علم اور مشکیزہ لے کر اندر آئے۔ غم کے عالم میں نڈھال کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے، بال بکھیرے ہوئے حرم میں آ کر اپنی بہن زینب سے کہنے لگے کہ ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔ انھوں نے زینب کو ڈھارس بندھائی اور کہا کہ بھائی لڑکوں کی نگہبانی اور پرورش تمھیں کرنی ہے۔ تم ہی علم دار یعنی حضرت عباس کے سوگ کی مہتمم یعنی نگراں اور ذمہ دار ہو۔

24.3.4 ماحصل

مرزا سلامت علی دبیر اُردو کے اہم مرثیہ گو شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش ۲۹/اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں ہوئی۔ بچپن میں والد کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے وہ یہاں کی آب وہوا اور ماحول میں رچ بس گئے۔ ان کا شمار دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک زود گو مرثیہ نگار شاعر تھے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں مرثیے کہے ہیں۔ ان کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۳ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور کے مرثیوں میں فنی اظہار کم ہے اور اہلِ بیت سے اظہارِ عقیدت زیادہ ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کا دوسرا دور ۱۸۳۳ء سے شروع ہوتا ہے جس میں انھوں نے مرثیہ نگاری کے متعینہ اجزا کی پیروی کی ہے۔ ان کے مرثیوں کا مطالعہ کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مرثیہ نگاری کا بنیادی مقصد حزنیہ مضامین کا بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی موقع پاتے ہیں، حزنیہ مضامین کو شامل کر دیتے ہیں اور حزنیہ ورثائیہ مضامین کے بیان میں ہی ان کا فن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کا

قلم رخصت، سراپا نگاری اور بین کو نظم کرنے میں بہت فعال دکھائی دیتا ہے، بالخصوص رخصت اور بین میں خواتین کے جذبات کا اظہار وہ بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی گہری نظر تھی، علمیت ان کی پہچان تھی اور صنائع و بدائع کے استعمال میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے یہاں روایات، اشخاص اور مختلف علوم کی اصطلاحات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں روایات اور تلمیحات کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ علمیت، مشکل پسندی، نادر تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کا حسین استعمال ان کی مرثیہ نگاری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ اُردو مرثیہ نگاری کے ایک ایسے اہم ستون ہیں جن کے ذکر کے بغیر اُردو مرثیہ کی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہے گی۔

24.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے سوانحی احوال و کوائف سے آگہی حاصل کی۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری سے بحث کی۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مشہور مرثیہ 'کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے' کے منتخب بند کی قرأت کی۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مشہور مرثیہ 'کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے' کے منتخب بند کی تشریح کو سمجھا۔

24.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کے سوانحی احوال و کوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۲۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ سے پہلے شمالی ہند کے اُردو مرثیہ گو شاعروں کے نام بتائیے۔

۳۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور ابتدائی دور میں ان کی مرثیہ نگاری کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

۴۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۵۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کے درج ذیل بند کی تشریح کیجیے:

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت — نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
چہرے پہ مہ عید کی بے جا ہے اشارت — وہ عید کا مژدہ ہے یہ حیدرؑ کی بشارت
ابرو کی مہ نو میں نہ جنبش ہے نہ ضو ہے
اک شب وہ مہ نو ہے یہ ہر شب مہ نو ہے

24.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مرزا دبیر کا پورا نام سلامت علی اور تخلص دبیر ہے۔ والد کا نام مرزا غلام حسین ہے۔ دبیر کی پیدائش ۲۹/اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں ہوئی۔ سات سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ سولہ برس کی کم عمر میں انھوں نے عربی و فارسی علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ دورانِ تعلیم ہی انھوں نے مرثیہ کہنا شروع کر دیا۔ ان کی موزوں طبیعت کو دیکھ کر ان کے والد ۱۸۱۵ء میں انھیں اس وقت کے مشہور مرثیہ گو شاعر میر مظفر حسین ضمیر کے پاس لے گئے۔ میر مظفر حسین ضمیر نے ان کی شاعری کے جوہر کو پہچان کر اپنی شاگردی میں رکھ لیا جس سے ان کے فن میں بڑا نکھار پیدا ہوا۔ اس طرح ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۱۵ء میں ہوا۔ ۱۸۵۷ء تک لکھنؤ میں مقیم رہے۔ ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد کا رُخ کیا۔ ۱۸۷۴ء میں ضعف بصارت کی شکایت لاحق ہوئی۔ چنانچہ نواب واجد علی شاہ کی خواہش پر علاج کی غرض سے کلکتہ کا سفر کیا اور مٹیا برج میں مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اُردو کے اس مایہ ناز مرثیہ گو شاعر نے ۶/مارچ ۱۸۷۵ء کو لکھنؤ میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے مکان میں مدفون ہوئے۔

۲۔ مرزا سلامت علی دبیر سے پہلے شمالی ہند کے اُردو مرثیہ گو شاعروں میں میر تقی میر، سودا، دلگیر، فصیح، ضمیر، خلیق، سکندر اور سید محمد تقی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۳۔ مرزا سلامت علی دبیر کی مرثیہ نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۳ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کا دوسرا دور ۱۸۳۳ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی دور میں ان کی مرثیہ نگاری کا بنیادی مقصد اظہارِ فن نہیں بلکہ اہلِ بیت سے اظہارِ عقیدت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کے ان کے مرثیوں میں عربی کے بھاری بھرکم الفاظ اور حشو و زائد کی مثالیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں اور زبان و بیان کی وہ پختگی نظر نہیں آتی جو بعد کے مرثیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

۴۔ مرزا دبیر اردو کے اہم مرثیہ نگار ہیں مرثیہ گوئی میں ان کی شناخت نادر تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے مرثیوں میں پرشکوہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور بہ نسبت رزمیہ مضامین کے حزنیہ مضامین کو زیادہ کامیابی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں۔ رزمیہ مضامین کو بیان کرنے کے لیے جس طرح کی جزئیات نگاری کی ضرورت ہے وہ دبیر کے یہاں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا اصل جوہر حزنیہ مضامین میں کھلتا ہے۔ وہ زبان و بیان اور صنائع و بدائع کے امام ہیں جہاں کہیں بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ اپنے اس فن کے اظہار سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ دبیر کی مرثیہ نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۳ء تک ہے۔ دوسرا دور ۱۸۳۳ء کے بعد کا ہے۔ پہلے دور میں ان کے یہاں اظہارِ فن پر وہ زور نہیں ملتا جو دوسرے دور کی خاصیت ہے۔ اگر اجزائے ترکیبی کی بات کریں تو دبیر بین، سراپا نگاری اور رخصت کے مضامین بیان کرنے پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ دبیر کے مرثیوں میں ایک خاص قسم کی علمیت جھلکتی ہے۔ کم ہی مرثیہ نگار ہوں گے جو اشخاص، روایات اور علمی اصطلاحات کے استعمال میں دبیر کی برابری کر سکیں۔

۵۔ مرزا سلامت علی دبیر کے اس بند میں حضرت عباس کے سراپے کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ کربلا کی روایات کے مطابق حضرت عباس بہت خوب صورت تھے۔ اُردو مرثیہ میں ان کی سراپا نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ اس بند میں حضرت عباس کے سراپے کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر نرگس سے حضرت عباس کی آنکھ کی تشبیہ دی جائے تو یہ ان کی آنکھوں کی توہین ہوگی کیوں کہ نرگس میں نہ پلکیں ہیں اور نہ

بینائی ہے جب کہ حضرت عباس کی آنکھوں میں خوب صورت پلکیں ہیں اور ان کی آنکھیں قوت بینائی سے معمور ہیں۔ ان کے چہرے کو چھوڑ کر عید کے چاند کی طرف دیکھنا بے کار ہے کیوں کہ آسمان میں نکلنے والا چاند اگر عید کی خوش خبری دیتا ہے تو آپ کا رخ انور حیدر کرار کی بشارت دیتا ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں عید کے چاند اور حضرت عباس کے رخ انور کا موازنہ کرتے ہوئے مزید کہا گیا ہے کہ نئے مہینہ کے چاند میں ابرو کی جنبش نہیں ہے اور نہ ہی وہ روشنی ہے جو آپ کے رُخ انور سے عیاں ہے۔ یہ چاند صرف ایک رات کے لیے نیا چاند ہے جب کہ یہ ہر رات نیا چاند ہے۔ پہلے مصرعہ میں آنکھ کی مناسبت سے عین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کو صنعت تجنیس کہتے ہیں۔ اس بند میں مرزا دبیر نے صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے حسین استعمال کے ذریعے حضرت عباس کے سراپے کو بیان کرنے میں غیر معمولی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

24.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
ساغر	:	شراب کا پیالہ، جام
تشنہ لب	:	جس کے ہونٹ پیاس کی وجہ سے خشک ہو گئے ہوں، پیاسا
آب بقا	:	آب حیات، ایسا پانی جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کو پینے والے کی موت نہیں آتی ہے
میٹھا برس	:	اٹھارہواں سال، شادی کی عمر
جوق	:	فوج کا دستہ، جماعت، گروہ
بوق	:	نرسنگھا، بگل، ترہی
تُمن	:	دس ہزار سواروں کا دستہ، رسالہ، پلٹن
مدحت	:	تعریف و توصیف
صاد	:	انتخاب، پسندیدگی
خامہ قدرت	:	قدرت کا قلم
پچھاڑیں کھانا	:	زمین پر لوٹنا
رن	:	میدان جنگ، لڑائی، معرکہ
رستم	:	ایران کا ایک مشہور پہلوان
قصر سلاطین	:	بادشاہوں کے محل
زمن	:	زمانہ
چرخ	:	آسمان

کہن	:	پُرانا
شمشیر بکف	:	ہاتھ میں تلوار
افلاک	:	آسمان
جلادفلک	:	آسمان کا جلاد، مراد مریخ ستارہ
وَا	:	کھُلا ہوا
جوزا	:	تیسرا آسمانی برج
غلطاں	:	لڑھکتا ہوا، گھومتا ہوا
عطارد	:	دوسرے فلک پر ایک سیارہ جس کو دبیر فلک اور منشی فلک بھی کہتے ہیں، مراد علم و عقل
جبرئیل	:	چار اہم فرشتوں میں سے ایک جو نبیوں پر وحی لایا کرتے تھے

24.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	اُردو مرثیے کا ارتقا	:	ڈاکٹر مسیح الزماں
۲۔	مطالعۂ دبیر	:	مشکور حسین یاد
۳۔	مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری	:	ایس۔اے صدیقی
۴۔	مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے	:	مرزا محمد زماں آزردہ
۵۔	اُردو مرثیہ نگاری (مرتبہ)	:	ڈاکٹر اُمِ ہانی اشرف

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی۔ 25 میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ

ساخت

25.1 اغراض ومقاصد

25.2 تمہید

25.3 میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ

25.3.1 اردو میں موازنہ اور مقابلہ کی روایت

25.3.2 انیسؔ و دبیرؔ: اشتراک وافتراق کے چند گوشے

25.3.3 شبلی نعمانی کی کتاب 'موازنہ انیسؔ و دبیرؔ' کا مطالعہ

25.3.4 ماحصل

25.4 آپ نے کیا سیکھا؟

25.5 اپنا امتحان خود لیجیے

25.6 سوالوں کے جواب

25.7 فرہنگ

25.8 کتب برائے مطالعہ

25.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبہ! اس اکائی میں آپ:

- قدیم لکھنؤ کے ادبی ماحول سے واقف ہوں گے۔
- شاعری میں استادی وشاگردی کی روایت کے بارے میں جان سکیں گے۔
- شاعروں کی باہمی چشمک اور ان کے اسباب کی معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی زندگی کے اہم گوشوں سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- میر انیسؔ اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ کر سکیں گے۔
- علامہ شبلی کی کتاب ''موازنہ انیسؔ و دبیر'' کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔

25.2 تمہید

عزیز طلبا! اس بلاک کی پچھلی اکائیوں میں آپ نے مرثیہ کے فن اور اس کی روایت کے بارے میں پڑھا۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ اردو مرثیہ گوئی میں سب سے زیادہ شہرت میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کو ملی۔ دونوں ہم عصر ہیں اور دونوں مرثیہ گوئی کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کی ادبی فضا میں ان دو باکمال مرثیہ گویوں میں مقابلہ آرائی لکھنؤ کی ادبی روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔

ان دونوں کی معرکہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ کے اہل ذوق دو خیموں میں بٹے ہوئے تھے ایک گروہ کو 'انیسیے' اور دوسرے کو 'دبیرئے' کہا جاتا تھا۔ اس اکائی میں ان دونوں کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ کریں گے اور یہ جانیں گے کہ کن خصوصیات کی بنیاد پر وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ساتھ ہی اس موضوع پر مولانا شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' کا بھی جائزہ لیں گے۔

25.3 میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ

25.3.1 اردو میں موازنہ اور مقابلہ کی روایت

مشرقی شعری روایت میں دو باکمال شاعروں کے درمیان موازنہ اور مقابلہ کی قدیم روایت رہی ہے۔ دو کامل استاد شاعر اور ان کے شاگردوں کے مابین ایک دوسرے پر برتری کے لحاظ سے موازنہ اور مقابلہ رہتا۔ اس موازنہ میں شعرا سے زیادہ ان کے شاگردوں اور چاہنے والوں کا حصہ ہوتا تھا۔ درمیان میں اساتذہ بھی چند اشعار ایسے کہہ دیتے تھے جس سے اس معرکہ آرائی کو ہوا مل جاتی تھی۔ میرؔ و سوداؔ، مصحفیؔ و انشاؔ، میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کے ادبی معرکے اردو ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اردو کے ادبی معرکوں کو مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ 'آب حیات' میں آپ مختلف شاعروں کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائیوں کی تفصیل پڑھ سکتے ہیں۔ زبان و ادب کو ان معرکہ آرائیوں سے فائدہ بھی ہوا۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں بہتر سے بہتر اشعار پیش کر کے خود کو برتر ثابت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ہر شاعر کو یہ خوف بھی رہتا تھا کہ زبان و بیان میں کسی قسم کی غلطی ہونے پر مقابل گروہ اسے اچک لے گا۔

جب میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی شہرت دور دور تک پھیلی تو ان دو باکمال مرثیہ گویوں کے درمیان بھی مقابلہ اور موازنہ کیا جانے لگا۔ روایت ہے کہ اس زمانے میں لکھنؤ کے باذوق لوگ دو فریق میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک فریق 'انیسیہ' کہلاتا اور دوسرا 'دبیریہ'۔ ایک زمانے تک دونوں گروہوں میں مقابلہ آرائی ہوتی رہی۔ یہ معرکہ آرائی بھی تاریخ کے کسی گوشے میں گم ہو جاتی اگر مولانا شبلی نعمانی 'موازنہ انیسؔ و دبیرؔ' جیسی تقابلی کتاب نہ لکھتے۔ اس میں دونوں شاعروں کی خصوصیات کا جائزہ لے کر ایک کو دوسرے پر فائق قرار دیا گیا ہے۔ شبلی کی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' کے بارے میں آپ اس اکائی کے آخر میں پڑھیں گے۔ اس سے پہلے ہم میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔

25.3.2 انیسؔ و دبیرؔ: اشتراک و اختلاف کے چند گوشے

عزیز طلبہ! میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دو ایسے نام ہیں جن کے بغیر اردو مرثیہ کی تاریخ ادھوری اور نامکمل ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی نام لیں تو ذہن خود بخود دوسرے کی طرف چلا جاتا ہے۔ اردو کے سبھی تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر ایک ساتھ ایک خاص پس منظر میں کیا ہے۔ یہ معاملہ صرف ان کی شاعری تک محدود نہیں ہے۔ ان دونوں کے حالات زندگی میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کی پیدائش تقریباً ایک زمانے میں ہوئی۔ میر انیسؔ ۱۸۰۳ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا میر حسن دہلوی بچپن میں اپنے والد کے ساتھ دہلی سے ہجرت کر کے اودھ کے دارالخلافہ فیض آباد آئے تھے۔ پھر وہ اور ان کا

خاندان یہیں کا ہوکر رہ گیا۔فیض آباد سے لکھنؤ دارالخلافہ منتقل ہونے کے ساتھ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی لکھنؤ کی شناخت کا اہم حصہ بن گئیں۔

مرزا دبیرؔ کی پیدائش بھی ۱۸۰۳ء میں ہوئی۔ان کی جائے پیدائش دہلی ہے۔سولہ سال کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور یہیں بس گئے۔میر انیسؔ کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کا رشتہ دہلی سے زیادہ قوی ہے اس لیے کہ ان کی پیدائش دہلی ہی میں ہوئی تھی اور بچپن کے کچھ سال بھی انہوں نے وہیں گزارے اس کے باوجود دہلویت میر انیسؔ کے یہاں مرزا دبیرؔ سے کہیں زیادہ ہے۔

میر انیسؔ کا خاندان شعروشاعری میں ایک زمانے سے مشہور ومعروف تھا۔خود وہ ایک مرثیہ میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ اردو کے بڑے مرثیہ گو تھے۔مرثیہ گوئی میں ان کا مقابلہ میر ضمیرؔ اور دلگیرؔ جیسے بلند پایہ مرثیہ گویوں سے کیا جاتا ہے۔ان کے والد میر حسن دہلوی اردو کی مشہور 'مثنوی سحرالبیان' کے خالق تھے۔میر حسن کے والد میر ضاحک بھی اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ گو تھے۔

اس کے برخلاف مرزا دبیرؔ کے خاندان میں شعروشاعری کا رواج نہیں تھا۔البتہ ان کے والد ایک سخن فہم اور شعروشاعری کے دلدادہ تھے۔جب انہوں نے مرزا دبیرؔ کا شاعری سے شغف دیکھا تو انہیں میر ضمیرؔ کی شاگردی میں دے دیا جہاں ان کی شعری صلاحیتیں پروان چڑھیں۔میر انیسؔ کے استاد میر خلیقؔ تھے جو میر ضمیرؔ کے ہم عمر تھے۔میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں نے دیگر مقبول ومروجہ اصناف کو چھوڑ کر مرثیہ،سلام اور رباعی تک خود کو محدود رکھا اور صنف مرثیہ کو فنی بلندیوں سے سرفراز کیا۔میر انیسؔ کا انتقال مرزا دبیرؔ سے ایک سال پہلے ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ان کے انتقال پر کئی شعراء نے تاریخیں لکھیں لیکن سب سے زیادہ مشہور تاریخ مرزا دبیر کی ہے:

''طور سینا بے کلیم اللہ ومنبر بے انیس''

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا موازنہ کرتے وقت ضروری ہے کہ ان کے درمیان اتصال اور افتراق کے امور کی نشاندہی کی جائے۔چنانچہ ان دونوں کے درمیان اشتراک وافتراق کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جارہی ہے تاکہ دونوں کی مرثیہ نگاری کی منفرد خصوصیات سامنے آسکیں۔

عزیز طلبہ!انیسؔ اور دبیرؔ دونوں کی شعری صلاحیتیں لکھنؤ میں پروان چڑھیں اس کے باوجود دونوں کی شاعری کا رنگ کچھ معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔انیسؔ کا میلان سادگی اور اصلیت کی طرف ہے۔اگرچہ ان کا خاندان ان کے دادا میر ضاحک کے زمانے سے فیض آباد میں آباد تھا (اودھ کا دارلخلافہ) اس کے باوجود میر انیسؔ نے لکھنؤ کے شاعروں کی کچھ اہم خصوصیات سے خود کو دور رکھا۔وہ اپنی دہلوی نسبت پر فخر کرتے تھے،ان کا شعری میلان دبستان دہلی کی طرف ہے یہی وجہ ہے کہ انیس کی زبان میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے ایک بند ملاحظہ کریں جس میں میر انیسؔ نے حضرت عباس کے رخصت کی

منظر کشی کی ہے:

باتیں یہ سن کے روتی ہیں زینب جھکائے سر　　تھرا رہی ہے زوجۂ عباس نامور
چہرہ تو فق ہے گود میں ہے چاند سا پسر　　مانع ہے شرم روتی ہے منہ پھیر پھیر کر
موقع نہ روکنے کا ہے نہ ہی بول سکتی ہے
حضرت کے منہ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے
عباس دیکھتے ہیں جو زوجہ کا اضطرار　　ہوتا ہے تیرِ غم جگر ناتواں کے پار
روتے ہیں خود مگر یہ اشارہ ہے بار بار　　شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بے قرار؟
آؤ ادب سے دلبر زہرا کے سامنے
روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے؟

مذکوہ بالا بندوں میں زبان کی صفائی اور برجستگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔انیس کا جوہر انسانی جذبات کی ترجمانی میں کھل کر سامنے آتا ہے۔کلیم الدین احمد انیسؔ کی مرثیہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انیسؔ واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔انسانی کردار افعال خصوصاً جنگ ونزاع تو نہایت جوش وصفائی سے بیان کرتے ہیں۔کہیں کوئی شے مبہم وتاریک نظر نہیں آتی۔ ہر تفصیل مثل روز روشن عیاں ہے۔انسانی افعال ساکن ہوں یا متحرک وہ ہر دو رخ کی تصویر یکساں کھینچتے ہیں۔ وہ واقعیت کی بجنسہ نقل نہیں کرتے بلکہ اپنے تخیل سے ان میں رنگ بھرتے ہیں۔ان کا دعوی بے جا نہیں کہ ان کی نقاشی سے مانی وبہزاد دنگ ہیں۔ یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں کہ ''خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ'' (کلیم الدین احمد،اردو شاعری پر ایک نظر،ص ۱۴۶)

مرزا دبیرؔ کی شناخت علمیت،مشکل پسندی،مضمون آفرینی،ضلع جگت اور صنعتوں کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ اس کی خاص وجہ لکھنوی تہذیب اور کلچر ہے جس کی بدولت وہاں کے عوام وخواص کی دہلی سے الگ پہچان قائم ہوئی۔ دبیرؔ کی شعری تربیت جس زمانے میں ہوئی اس وقت لکھنؤ میں اردو کے علاوہ عربی وفارسی علوم وادب کا چرچہ تھا۔ یہاں خاص طور پر متأخرین شعرائے فارسی کا کلام شوق سے پڑھا جاتا تھا۔لکھنؤ میں بادشاہت کے اعلان کے ساتھ یہاں کے ارباب اقتدار اور عوام دونوں میں دہلی سے الگ اپنی شناخت بنانے پر زور دیا گیا۔ یہاں کے شعرا نے داخلیت کے بجائے خارجیت پر زور صرف کیا۔نازک خیالی،ضلع جگت،دقت پسندی،ظاہر پرستی میں یہاں کے شعرا ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔مال و دولت کی فراوانی کی وجہ سے عیش وعشرت کا دور دورہ تھا۔زندگی میں ایک خاص قسم کا تکلف اور تصنع پایا جاتا تھا۔دبیرؔ یہاں کے ماحول میں پوری طرح رچ بس گئے۔لکھنوی خصوصیات کے ساتھ وہ مشرقی علوم پر اچھی دسترس رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں صناعی اور علمیت کی شان نظر آتی ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور صنعتوں کا خوب استعمال کرتے ہیں۔تخیل آرائی،مبالغہ آرائی،دقیق تشبیہات واستعارات اور غیر معروف تلمیحات سے اپنے کلام کو مشکل بنا دیتے ہیں۔کئی دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعے کی تصویر کشی سے زیادہ اپنی علمیت اور زبان دانی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے دبیرؔ کی مشکل پسندی اور معنی آفرینی کے تین درجات شمار کرائے ہیں۔ پہلا درجہ وہ ہے جہاں پڑھنے والے کو ان کی مشکل پسندی اور معنی آفرینی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیونکہ ندرت خیال سے ایک جہان معانی پیدا ہو جاتا ہے جو غور و فکر کی طرف دعوت نظارہ دیتا ہے۔ دوسرا درجہ وہ ہے جہاں اس مشکل پسندی کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا درجہ وہ ہے جہاں ان کی معنی آفرینی محض ذہنی بازیگری بن کر رہ جاتی ہے۔ دبیر کے یہاں پہلے درجے کے مقابلے میں دوسرے اور تیسرے درجے کی مثالیں زیادہ ہیں۔ یہ دبیرؔ کی شاعری کا ایک تاریک پہلو ہوتے ہوئے بھی ان کی شخصیت کا ایک ایسا رنگ ہے جو ان کی شناخت کا حصہ ہے۔ مشکل پسندی اور پرشکوہ الفاظ کا استعمال ان کی شاعری کو رزمیہ شاعری سے قریب کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

بہر فروغ سامعہ و نور باصرہ　　پڑھتا ہوں اور لکھتا ہوں الفاظ فاخرہ
زہرا بتول فاطمہ معصومہ طاہرہ　　ام الائمہ شافعہ مظلوم صابرہ
صدیقہ و مبارکہ و زاکیہ ہے یہ
مرضیہ و محدثہ و راضیہ ہے یہ

(ایس۔اے صدیقی، مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری ص ۴۰۷)

مذکورہ بالا بند پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دبیرؔ نے صنعتوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ اور صنعت تضاد کے علاوہ تلمیحات کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔ صنعتوں کے استعمال کے علاوہ جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ دبیر نے ان اشعار میں دقیق الفاظ کا خوب استعمال کیا ہے۔ بقول مہذب لکھنوی دقیق الفاظ جو مظہر بلاغت ہیں مرزا کی خاص زبان ہے۔ دبیر کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے مختلف صنعتوں کا استعمال کیا ہے:

صنعت تضاد:

حق یہ ہے کہ رگ و ریشہ میں ڈر بیٹھ گیا ہے
کیا پاؤں اٹھیں رن کو کہ جی بیٹھ گیا ہے

صنعت ایہام:

تھا خاک میں نور قدم فاطمہ زہرا
پارا ہوا کاجل نہ کسی آنکھ میں ٹھہرا

یہاں 'پارا ہوا' کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ کاجل پارا ہو کر اڑ گیا۔ دوسرا کاجل بنانے کے عمل کو کاجل پارنا کہتے ہیں۔

ایک اور مثال دیکھیں جس میں دبیرؔ نے معنی آفرینی کے لیے لسانی اصطلاحات کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ علمی اصطلاحات خواہ اس کا تعلق علم نجوم سے ہو یا علم السنہ سے دبیر کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کھولی گرہ کہ موئے کمر کو خبر نہ تھی　　یہ مبتدا وہ تھی کہ خبر کو خبر نہ تھی
اور بیچ میں وہ گرز گراں ابر الحذر　　جس طرح واو عطف کا مابین خیر و شر

لکھنے کی اور پڑھنے کی ابجد سے ہے بنا
اب جد و کد ثنائے فرس میں کروں میں کیا

سُم اس کا اپنے پیش سے بالجزم ہے بنا ترکیب زیر سے یہ زبردست ہے خفا
اعراب خوب رکھتی تھی مولا کی ذوالفقار تھا پیش سے عیاں کہ اجل کی ہے پیش کار

کسرہ سے کسرشان مخالف تھی آشکار
فتحہ سے فتح یاب رہی وقت کارزار

(ایس۔اے صدیقی، دبیر کی مرثیہ نگاری، ص ۴۰۸)

اس طرح اگر دیکھیں تو انیسؔ کے یہاں سادگی اور اصلیت کا عنصر قوی ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری فطرت سے زیادہ قریب ہے۔ جبکہ مرزا دبیرؔ کے یہاں فن کے اظہار پر زیادہ زور ہے۔ انیسؔ کے یہاں واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری مرزا دبیرؔ کے مقابلے میں زیادہ پختہ طور پر سامنے آتی ہے۔ مرزا دبیرؔ ایک زود گو مرثیہ نگار تھے۔ ان کے مرثیوں میں ایسے بند بھی مل جائیں گے جو جذبات نگاری اور جزئیات نگاری میں میر انیسؔ کے ہم پلہ صحیح لیکن اصل معاملہ شعری مزاج اور سلاست روی کا ہے۔ میر انیسؔ کی اصل شناخت سادگی ہے اور دبیرؔ کی مشکل پسندی۔ انیسؔ کے کلام سے عام قاری بھی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ لیکن دبیرؔ کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص علمی مذاق اور ادبی ذوق کی ضرورت ہوگی۔

ایسی بات نہیں کہ دبیرؔ کے یہاں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو انیسؔ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کا کلام بھی مذکورہ بالا خوبیوں سے معمور ہے۔ اصل میں دبیرؔ کا کلام ہموار نہیں ہے ان کے یہاں انیسؔ کے برعکس ابتدا سے انتہا تک ایک ہی فضا نہیں رہتی۔ انیسؔ کے یہاں مذکوہ بالا خوبیاں مرثیہ کے اکثر حصوں میں مل جاتی ہیں لیکن دبیرؔ کے یہاں منتخب حصوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ واقعہ نگاری میں جہاں انہوں نے اقتضائے حال کا خیال رکھا ہے اور اپنی علمیت کا جوہر دکھانے کی سعی نہیں کی ہے وہاں ان کا جوہر پوری طرح کھل کر سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بند ملاحظہ کریں جس میں امام حسین یزیدی لشکر سے اپنے چھ ماہ کے بچے کے لیے پانی کی درخواست کررہے ہیں:

ہر ایک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفیٰ لے تو چلا ہوں فوج عمرو سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا؟

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج کے گھبرا کے رہ گئے چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

کربلا کا میدان ہے۔ حسینی لشکر ایک ایک بوند پانی کے لیے ترس رہا ہے۔ اپنے چھ ماہ کے بچے کی حالت دیکھ کر امام حسین

دشمن کی فوج کے سامنے پانی کے لیے جاتے ہیں لیکن ان سے سوال کرتے ہوئے شرم حائل ہے۔اگر سوال کیا بھی تو اپنی زبانی نہیں بلکہ بیٹے کے چہرے سے چادر اٹھا کر اس کی زبانی کہا کہ 'اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں' اس بند میں جذبات نگاری، مرقع نگاری اور نفسیاتی کیفیت کا اس خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے کہ شبلی نے لکھا ہے کہ دبیرؔ نے جو بلاغت صرف کی ہے وہ کوئی اور نہیں کر سکا۔

دبیرؔ کے یہاں انیسؔ کے مقابلے میں تسلسل کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔مرثیہ ایک طویل نظم ہوتی ہے اس میں ابتدا سے انتہا تک معیار کو برقرار رکھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔اس معاملے میں انیسؔ دبیرؔ پر فائق نظر آتے ہیں۔

دبیرؔ کے نزدیک مرثیہ کا بنیادی مقصد اہل بیت کی یاد میں رونا اور رلانا ہے۔اس مقصد کے لیے دبیر مرثیہ کے ہر جزء میں حزنیہ مضامین کو شامل کر لیتے ہیں۔حزنیہ مضامین کا بیان ہی ان کا اصل جوہر ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ کے شعری مزاج کو سمجھنے کے لیے ایک ہی مضمون پر کہے گئے دونوں کے اشعار کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔کربلائی مرثیوں میں چونکہ واقعات کربلا کو نظم کیا جاتا ہے اس لیے دونوں کے یہاں ایک ہی قسم کے مضامین مل جاتے ہیں۔کئی دفعہ مضمون کے ساتھ ردیف اور قافیوں میں بھی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ دونوں نے ان واقعات کو شعر میں کس طرح باندھا ہے۔چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

امام حسین گھر کے سبھی افراد کو ساتھ لے کر روانہ ہو رہے ہیں مگر صغرا کی طبیعت ناساز ہے لہذا انہیں وہیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ طے پاتا ہے۔اس موقع پر صغرا کے دلی جذبات کی ترجمانی انیسؔ اور دبیرؔ دونوں نے کی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مرزا دبیرؔ:

صغرا نے کہا صاحبو کیا کرتے ہو گفتار
اک بات پکڑلی کہ یہ بیمار ہے بیمار
شاید کہ سفر ہی میں شفادے مجھے غفار
یاں کون خبر لے گا مری یہ در ودیوار
اتنی بھی تو طاقت نہیں جو اٹھ کے کھڑی ہوں
اے لوگو! میں کیا آپ سے بیماری پڑی ہوں

میر انیسؔ:

کیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں بیمار
ہے کونسی تقصیر کہ سب ہوگئے بیزار
زندہ ہوں یہ مردہ کی طرح ہوگئی دشوار
کیوں جاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار
حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چرالیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

دبیرؔ نے صغرا کی زبانی کہلوایا ہے کہ میرے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ میں اٹھ کر کھڑی ہو جاؤں۔ جب ایسی حالت ہوگی تو کوئی سفر کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہے؟ ''اک بات پکڑ لی'' ایک عامیانہ جملہ ہے جس کے اندر طنز پایا جاتا ہے۔ دونوں کی شاعری پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ کے یہاں دبیرؔ کے مقابلہ میں صغرا کی حسرت اور بے کسی کی تصویر زیادہ واضح ہے۔ وہ اپنی بیماری کی شدت ظاہر کرنے کے بجائے اس کو معمولی ثابت کر رہی ہیں تا کہ ان کو بھی سفر کی اجازت مل جائے۔ موقع اور مقتضی کے لحاظ سے یہ گفتگو زیادہ کارگر ہے۔

ایک اور مثال دیکھیں جس میں دونوں نے حضرت علی کے فضائل میں وارد نصوص "هل اتی "، "عطا"، "لافتی"، "انما" اور "قل کفی" کا استعمال کیا ہے۔

مرزا دبیرؔ:۔

اہل عطا میں تاج سر ھل اَتی ہیں یہ　　اغیار لاف زن ہیں شہ لافتی ہیں یہ
خورشید انور فلک انما ہیں یہ　　کافی ہے شرف کہ شہ قل کفی ہیں یہ

میر انیسؔ:۔

حق نے کیا عطا پہ عطا ھل اتی کسے　　حاصل ہوا ہے مرتبہ لافتی کسے
کونین میں ملا شرف انما کسے　　کہتی ہے خلق، بادشہ قل کفی کسے

دبیرؔ نے اس موضوع کو خبر کے طور پر پیش کیا ہے جبکہ انیسؔ نے استفہام کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ شعر میں روانی اور مفہوم دونوں لحاظ سے انیس کا کلام دبیر پر فائق ہے۔

امام حسین کی شہادت کے بعد اہل بیت اطہار کے قید کی روداد مرثیہ نگاروں نے خاص طور پر بیان کی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جہاں ان کی مظلومیت اور بے کسی کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قید خانے میں یزید کی بیوی ہند کے آنے کی روداد انیسؔ اور دبیرؔ دونوں نے بیان کی ہے۔ ہند کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں اہل بیت سے عقیدت تھی۔ ان کے شوہر نے جو بھی اہل بیت کے ساتھ کیا تھا اس پر رنجیدہ تھیں۔ ان کے قید خانہ میں آنے کی روداد دونوں نے بیان کی ہے ملاحظہ کریں:

مرزا دبیرؔ:

ناگاہ مشعلوں کی ہوئی روشنی نمود　　اور غل ہوا کہ ہند کا زنداں میں ہے ورود
زینب کے دل پہ صدمہ سبھوں سے ہوا فزود　　غربت سے کانپنے لگی وہ خاصہ ودود
سرزانوؤں کے بیچ میں شرما کے دھر لیا
اور بیڑیوں کو خاک میں پوشیدہ کرلیا
بچوں سے پھر یہ بولی آفت کی مبتلا　　اب نام لیجیو نہ مراتم پہ میں فدا

ناگاہ آئی قیدیوں میں ہند با وفا زنجیر پہنے دیکھ کے عابد کو دی ندا

بیداد اہل ظلم سے یارب دہائی ہے

اس ناتواں کو آہ یہ بیڑی پہنائی ہے

اسی مضمون کو انیسؔ اس طرح بیان کرتے ہیں:

نکلی محل سرا سے یہ کہہ کر وہ خوش سیر تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر

پہنچی جناب حضرت زینب کو یہ خبر رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگی سر کو پیٹ کر

اپنا نہیں خیال، بزرگوں کا پاس ہے

ہے ہے، کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ میں ہوں خواہر امام غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام

ہم ہیں فقیر، ہم میں امیروں کا کیا ہے کام لوگو بتا نہ دیجیو کہیں اس کو میرا نام

پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینب کدھر گئی

کہہ دیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مرگئی

مضمون اور انداز بیان دونوں تقریباً یکساں ہے۔ البتہ انیسؔ کے یہاں ڈرامائیت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

مرزا دبیرؔ:

کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں

آیــــــــــــــــــــــــہ نہ آیا مثل علی مدح جود میں

میر انیسؔ:

قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں

سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں

انیسؔ کہتے ہیں کہ جس انگوٹھی کی قیمت حجاز میں کوئی نہیں دے سکا اسے سائل کو نماز کی حالت میں دے دیا۔ یہی مضمون دبیر نے بھی ادا کیا ہے لیکن ان کا انداز تھوڑا پیچیدہ ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ ایک ہی کان دونوں پکڑ رہے ہیں مگر دبیر ہاتھ گھوما کر پکڑتے ہیں ۔ انیسؔ کے شعر میں صفائی اور برجستگی ہے جبکہ دبیرؔ نے صنعت تجنیس کے استعمال سے شعر فہمی اور قرأت میں دشواری پیدا کر دی اور مضمون بھی ثقیل ہو گیا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بقول ان دونوں کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ کا فرق ہے۔ انیسؔ کے یہاں دہلویت نمایاں ہے جب کہ دبیرؔ کے یہاں لکھنؤ کا رنگ غالب ہے۔ دونوں کے یہاں کئی مرثیے ایسے ہیں جن میں ردیف اور قافیے ایک ہیں، ممکن ہے کہ ایسا مقابلے کے لیے کیا گیا ہو۔ لیکن اکثر مرثیوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو پایا ہے کہ پہلے کس نے لکھا ہے، اس لیے آسانی سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس نے کس کا جواب دیا ہے۔

25.3.3 مولانا شبلی نعمانی کی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' کا مطالعہ

عزیز طلبا! میر انیس اور مرزا دبیر کے درمیان موازنہ پر سب سے اہم کتاب مولانا شبلی نعمانی کی 'موازنہ انیس و دبیر' ہے ۔اس کتاب کے ذکر کے بغیر یہ موضوع نامکمل رہے گا۔اس لیے ضروری معلوم ہوتا کہ ایک نظر اس کتاب پر بھی ڈال لی جائے۔

مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب کی ابتدا میں انیس و دبیر کے درمیان موازنہ اور مقابلہ کو بدمزاقی کی انتہا قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ کہ اردو تنقید میں موازنہ اور مقابلہ کا آغاز ہی شبلی کی اسی کتاب سے ہوتا ہے۔

کتاب کے مقدمہ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کا بنیادی مقصد میر انیس کی مرثیہ نگاری کی فنی خوبیوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔وہ دراصل یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ''اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے۔''اس کے لیے ان کے نزدیک سب سے موزوں شخصیت میر انیس کی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پوری کتاب میں میر انیس کی فنی خصوصیات سے بحث کی ہے اور آخر میں چند صفحات مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی پر شامل کر کے ان دونوں کا سرسری موازنہ پیش کر دیا ہے اس وجہ سے شبلی کے ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کے پیش نظر دبیر کا زیادہ تر کلام نہیں تھا۔انہوں نے مرزا انیس کو ترجیح کی مسند پر پہلے ہی بٹھا دیا تھا لہذا مرزا دبیر کی خامیوں کو خوب چن چن کر بیان کیا۔دبیریوں کا الزام ہے کہ شبلی نے ایک ہی موضوع پر دونوں کا کلام درج کرتے وقت میر انیس کا اعلی کلام اور دبیر کا کمتر کلام پیش کیا ہے۔

مولانا شبلی نے اپنی اس کتاب میں انیس کے کلام کی جو اہم خوبیاں شمار کرائی ہیں وہ یہ ہیں: واقعات کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا، روزمرہ اور محاروں کا خوبصورت استعمال، مضمون کے مطابق لفظوں کا برمحل استعمال، تشبیہات واستعارات میں جدت، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری وغیرہ۔

شبلی نے کتاب کے شروع ہی میں مرزا دبیر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں۔کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔''
>
> (شبلی، موازنہ انیس و دبیر، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۷، ص، ۲۴۷)

شبلی کے نزدیک دبیر اپنے کلام میں اکثر ثقیل اور غریب الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں بندش کی سستی اور ناہمواری پائی جاتی ہے۔جہاں وہ معنی آفرینی اور دقت پسندی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں، ان کے کلام میں تعقید پیدا ہو جاتی ہے۔ شبلی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دبیر کے کلام میں بھی جا بجا شاعری کے لوازم پائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ان کا ماننا ہے کہ ان کے یہاں یہ خصوصیات انیس کی تقلید کی وجہ سے آئی ہیں۔اس کے علاوہ شبلی دبیر کی جن خصوصیات کے قائل ہیں وہ مضمون بندی، خیال آفرینی اور نادر تشبیہات واستعارات ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''خیال آفرینی دقت پسندی جدت استعارات اختراع تشبیہات شاعرانہ استدلال شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے، کہیں تعقید اور اغلاق پیدا ہو جاتا ہے۔'' (شبلی، موازنہ انیس و دبیر، مطبع مفید عام،

آگرہ، ۱۹۰۷ء، ص ۲۵۴)

شبلی نے دبیر کی شاعری کے بارے میں جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک ہی جملے میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ ان کا کلام بلاغت سے عاری ہے۔ اگر ان کی کچھ خوبیاں شمار کراتے بھی ہیں تو اس سلسلے میں یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ اس کو صحیح سے برت نہیں سکے۔ بہرحال شبلی کا یہ کہنا کہ دبیر نے انیس کی تقلید کی ہے تو اکثر ناقدین نے ان کے اس دعوے کی تردید کی ہے۔

یہ فطری بات تھی کہ شبلی کے موازنہ کا ردعمل دبیریوں کی طرف سے ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں کئی اہل قلم میدان میں اتر آئے۔ ان میں سے زیادہ تر تحریریں اعتدال سے خالی نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں سے دو کتابیں خاص شہرت رکھتی ہیں۔ ایک ''المیزان'' دوسری ''حیات دبیر''۔ مولانا شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کا اثر دبیر پر لکھنے والوں پر اس قدر حاوی ہے کہ ان پر لکھی گئی زیادہ تر تنقیدی اور تحریریں موازنہ کا ہی عکس معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دبیر کے کلام کی چند منفرد خصوصیات بھی انیس کے یہاں موجود ہیں۔ مطلب یہ نکلا کہ دبیر کا اپنا کچھ نہیں سب انیس کی نقالی ہے۔ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر پر اگرچہ دبیر کے ساتھ ناانصافی کا الزام عائد کیا جاتا ہے لیکن ایک طرح سے یہ بھی حقیقت ہے کہ دبیر کی عظمت کی بنیاد استوار کرنے میں شبلی کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شبلی کو اگر انیس کے مقابل کوئی مرثیہ گو ملا تو وہ مرزا دبیر ہی ہیں۔ انہوں نے مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کی خامیوں کی نشاندہی کرتے وقت ان کی بعض اچھائیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ شبلی کے اکثر ناقدین بھی اس بات سے متفق ہیں کہ بحیثیت مجموعی انیس دبیر پر فائق ہیں۔

25.3.4 ماحصل

انیس اور دبیر اردو مرثیہ نگاری کے دو ایسے نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو مرثیہ کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ دونوں ہم عصر تھے۔ دونوں کی پیدائش ایک ہی سال ۱۸۰۳ء میں ہوئی۔ دونوں کا تعلق دہلی سے تھا۔ دبیر کی پیدائش دہلی ہی میں ہوئی تھی۔ انیس کی پیدائش اگرچہ لکھنؤ میں ہوئی لیکن ان کا خاندان دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ انیس کو اپنی دہلویت پر فخر تھا۔ گرچہ ان کا تعلق لکھنؤ اسکول سے ہے مگر لکھنؤ کے شعرا سے کئی معاملات میں مختلف تھے۔ مشرقی شعری روایت میں دو باکمال شعرا کے درمیان مقابلہ آرائی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انیس و دبیر سے پہلے بھی میر و سودا، انشا اور مصحفی کے درمیان ادبی چشمک ہوتی رہی ہے جو ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ ان ادبی معرکہ آرائیوں سے اردو زبان و ادب کو فائدہ پہونچا ہے۔ شعرا زبان و بیان کے معاملہ میں زیادہ چوکنا رہتے تھے انہیں خدشہ رہتا تھا کہ ذرا سی غلطی سے مخالف گروہ کو موقع مل جائے گا اور وہ ہمارا مذاق بنائے گا۔

انیس کا میلان سادگی اور اصلیت کی طرف ہے۔ انسانی کردار و افعال، جنگ و نزاع کو بیان کرنے میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ دبیر کی شناخت علمیت، مشکل پسندی، مضمون آفرینی، ضلع جگت اور صنعتوں کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ مبالغہ آرائی، دقیق تشبیہات و استعارات اور غیر معروف تلمیحات سے اپنے کلام کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی واقعے کی تصویر کشی کے بجائے اپنی علمیت اور زبان دانی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ شبلی نے 'موازنہ انیس و دبیر' میں برتری کا تاج انیس کے سر پر رکھا ہے۔ جن ناقدین کو شبلی سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے دبیر کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا، ان کی

بھی ایک بڑی تعداد اس بات پر متفق ہے کہ بحیثیت مجموعی مرثیہ میں انیس کا مرتبہ دبیر سے بلند ہے۔

بہر حال ان دونوں نے اردو مرثیہ کو ترقی کی راہ سے ہمکنار کیا ہے۔ دونوں کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں۔ کچھ خصوصیات میں میر انیس فائق ہیں تو کچھ میں مرزا دبیر۔

25.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی میں آپ نے انیس اور دبیر کی مرثیہ گوئی کا تقابلی مطالعہ کیا اور آپ نے جانا کہ:

میر انیسؔ کے کلام میں سادگی اور سلاست ہے جبکہ دبیرؔ کے یہاں مشکل پسندی ہے۔

مرزا دبیر صنعتوں کا استعمال خوب کرتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کا رنگ مضمون بندی اور خیال آرائی میں کھلتا ہے۔

میر انیسؔ جزئیات نگاری اور واقعہ نگاری کے امام ہیں۔

مرزا دبیرؔ حزن اور بین کے مضامین بیان کرنے پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔

میر انیسؔ کے یہاں انسانی نفسیات کے اظہار پر زور پایا جاتا ہے۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں اپنے اپنے لحاظ سے امام تصور کئے جاتے ہیں۔

25.5 اپنی جانچ خود کریں

۱۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی حالات زندگی میں کیا مماثلت پائی جاتی ہے بیان کریں۔

۲۔ مرزا دبیرؔ کی کونسی خصوصیات میر انیس سے جدا ہیں؟

۳۔ میر انیسؔ کی کونسی خصوصیات میر زا دبیر سے الگ ہیں؟

۴۔ مولانا شبلی نعمانی نے 'موازنہ انیس و دبیر' میں کس کے سر پر برتری کا تاج رکھا ہے اور کیوں؟

25.6 سوالات کے جوابات

۱۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ گوئی میں موازنہ اور مقابلہ ان کی زندگی سے لے کر اب تک کیا جاتا رہا ہے یہ معاملہ صرف ان کی شاعری تک محدود نہیں ہے۔ ان دونوں کی حالات زندگی میں بھی مماثلت کے کئی گوشے پائے جاتے ہیں۔ دونوں کی پیدائش تقریباً ایک زمانے میں ہوئی۔ دونوں کا تعلق دہلی سے ہے۔ میر انیس کے دادا میر حسن دہلی سے بچپن میں اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر کے فیض آباد آئے جو اس وقت اودھ کا دار الخلافہ تھا۔ اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مرزا دبیرؔ کی جائے پیدائش دہلی ہے۔ سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ انیسؔ کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کا رشتہ گرچہ دہلی سے زیادہ قوی ہے، لیکن اس کے باوجود دہلویت میر انیسؔ کے یہاں مرزا دبیرؔ سے کہیں زیادہ ہے۔

میر انیسؔ کا خاندان شعر و شاعری میں ایک زمانے سے مشہور و معروف تھا۔ وہ خود ایک مرثیہ میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ 'پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں'۔ اس کے برخلاف مرزا دبیرؔ کے خاندان میں شعر و شاعری کا رواج کا نہیں تھا۔

البتہ ان کے والد ایک سخن فہم اور شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ مرزا دبیرؔ کے استاد میر ضمیر تھے اور میر انیسؔ کے استاد میر خلیق تھے جو میر ضمیر کے ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں نے دوسری مقبول مروجہ اصناف کو چھوڑ کر مرثیہ، سلام اور رباعی تک خود کو محدود رکھا اور صنف مرثیہ کو فنی بلندی سے سرفراز کیا۔ دونوں کی وفات میں بھی زیادہ فاصلہ نہیں۔ میر انیسؔ کا انتقال مرزا دبیرؔ سے صرف ایک سال پہلے ہوا۔

۲۔ دبیرؔ کی شناخت علمیت، مشکل پسندی، مضمون آفرینی، ضلع جگت اور صنعتوں کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ لکھنؤ میں بادشاہت کے اعلان کے ساتھ یہاں کے ارباب اقتدار اور عوام دونوں میں دہلی سے الگ اپنی شناخت بنانے پر زور دیا گیا۔ چنانچہ داخلیت کے بجائے خارجیت پر یہاں کے شعرا نے زور صرف کیا۔ نازک خیالی، ضلع جگت، دقت پسندی، ظاہر پرستی میں یہاں کے شعرا ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ دبیر چونکہ یہاں کے ماحول میں پوری طرح رچ بس گئے تھے اور انہیں مشرقی علوم میں بھی دسترس حاصل تھی جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں علمیت اور مشکل پسندی نظر آتی ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ تخیل آرائی، مبالغہ آرائی دقیق تشبیہات و استعارات اور غیر معروف تلمیحات سے اپنے کلام کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی واقعے کی تصویر کشی سے زیادہ اپنی علمیت اور زبان دانی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے نزدیک مرثیہ کا بنیادی مقصد اہل بیت کی یاد میں رونا اور رلانا ہے اس وجہ سے ان کے یہاں حزنیہ مضامین کی بہتات ہے۔ انیسؔ کے کلام سے عام قاری بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ لیکن دبیرؔ کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص علمی مذاق اور ادبی ذوق کی ضرورت درکار ہے۔

۳۔ انیسؔ اور دبیرؔ دونوں کی شعری صلاحیتیں لکھنؤ میں پروان چڑھیں اس کے باوجود دونوں کی شاعری کا رنگ کچھ معاملات میں مختلف ہے۔ انیسؔ کا میلان سادگی اور اصلیت کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری فطرت سے زیادہ قریب ہے۔ کسی واقعے کو بیان کرتے ہیں تو تخیل کی آمیزش سے اس طرح پیش کرتے ہیں جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے۔ جبکہ دبیرؔ کے یہاں فن کے اظہار پر زور زیادہ پایا جاتا ہے۔ انیسؔ واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری میں دبیرؔ کے مقابلے میں زیادہ پختہ نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں واقعہ نگاری میں فطری تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ انسانی کردار افعال خصوصاً جنگ و نزاع کو نہایت جوش و صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ اگر انیسؔ اور دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کو ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان وہی فرق ہے جو دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں فرق ہے۔ انیسؔ کے یہاں دہلویت کا عنصر غالب ہے تو دبیر کے یہاں لکھنویت پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔

۴۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' میں برتری کا تاج میر انیسؔ کے سر پر رکھا ہے۔

25.7 فرہنگ

الفاظ : معانی

اشتراک : باہم، ساجھے داری

افتراق : مختلف ہونا، الگ ہونا

باصرہ : دیکھنے کی قوت، بینائی

پرشکوہ : شان وشوکت والا

تصنع : بناوٹی

تقصیر : کوتاہی، خطا

خواص : بیگمات کی لونڈی یا سہیلی

راضیہ : اصل راضی ہے۔آخر میں 'ہ' جوڑ کر مؤنث بنالیا گیا ہے۔

رنگ فق ہون : خوف یا پریشانی کی وجہ سے چہرے کا رنگ بدل جانا

زاکیہ : پاک، آخر میں 'ہ' جوڑ کر مؤنث بنالیا گیا ہے۔

سامعہ : سننے والی

سبط : آل واولاد

سُم : گھوڑے خچر یا گدھے کا پاؤں کا نیچے کا سخت حصہ

صدیقہ : سچی

صنعت ایہا : ایسی صنعت جس میں شاعر ایسا لفظ استعمال کرے جس کے دو معنی ہوں، ایک قریب کا دوسرا دور کا ۔شاعر کی مراد دور کے معنی سے ہو۔

صنعت تجنیس : دو ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو تلفظ میں مشابہ ہوں لیکن معنی الگ ہو۔

صنعت تضاد : شعر میں دو ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن کے معنی ایک دوسرے کی ضد ہوں۔

عدو : دشمن

فاخرہ : عمدہ، نادر

فرس : گھوڑا

فروغ : ترقی

فزود : زیادہ

مبارکہ : مبارک کی مؤنث

معاصر : ایک زمانے کا

مماثلت : مشابہت

نمود : نمائش، دکھائی دینا

25.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔ موازنہ انیس ودبیر : مولانا شبلی نعمانی

۲۔ اردو مرثیے کا ارتقا : ڈاکٹر مسیح الزماں

۳۔ اردو مرثیہ نگاری : ام ہانی اشرف

۴۔ دبیر کی مرثیہ نگاری : ایس۔اے صدیقی

۵۔ شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر: اکبر حیدری کاشمیری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY